فروری ۱۹۹۳ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

- دینی محاذ کا لائحۂ عمل

تفکر و تذکر ——— ڈاکٹر اسرار احمد

- تبلیغ کس لئے؟

مولانا امین احسن اصلاحی کی ایک معرکۃ الآراء تحریر

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

KHALID TRADERS

IMPORTERS – INDENTORS – STOCKISTS &
SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS,
FROM SUPER – SMALL TO SUPER – LARGE

AUTHORIZED AGENTS
NTN
BEARINGS

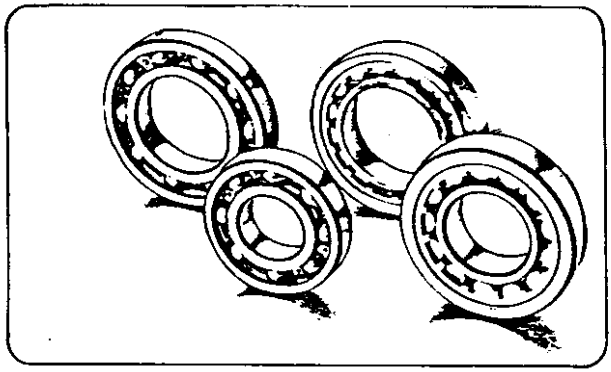

PLEASE CONTACT

TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734776

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65,
Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : **(Opening Shortly)**	Amin Arcade 42, Brandreth Road, Lahore-54000 Ph : 54169
GUJRANWALA :	1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

جلد: ۴۲
شمارہ: ۲
شعبان المعظم ۱۴۱۳ھ
فروری ۱۹۹۳ء
فی شمارہ ۵/-
سالانہ زرتعاون ۵۰/-

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، مسقط، بحرین، قطر، متحدہ عرب امارات۔	۲۰ سعودی ریال
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا۔	۶۔ امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ۔	۱۱۔ امریکی ڈالر
شمالی وجنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ۔	۱۴۔ امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰۔ فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

یکے از مطبوعاتِ تنظیم اسلامی، مرکزی دفتر: ۶۷۔ اے، علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو لاہور

پبلشر: لطف الرحمٰن خان، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

☆ عرض احوال ———— ۳
حافظ عاکف سعید
☆ تذکرہ و تبصرہ ———— ۷
دینی محاذ کا لائحہ عمل
ڈاکٹر اسرار احمد
☆ اسلام میں عدل اجتماعی کی اہمیت ———— ۱۵
بسلسلہ منہج انقلاب نبویؐ
ڈاکٹر اسرار احمد
☆ الہدیٰ (قسط ۸۳) ———— ۲۵
صبر و مصابرت: سورۂ آل عمران کی آخری آیت کی روشنی میں
ڈاکٹر اسرار احمد
☆ حسن انتخاب ———— ۳۴
تبلیغ کس لئے؟
مولانا امین احسن اصلاحی
☆ قند مکرر ———— ۴۹
مولانا مودودی مرحوم اور مسئلہ بیعت
امیر تنظیم اسلامی کی رائے پر "تکبیر" کراچی کا محاکمہ اور امیر تنظیم کی وضاحت
☆ افہام و تفہیم ———— ۶۳
"چہرے کا پردہ اور اسلام"
خالد محمود خضر
☆ رپورتاژ ———— ۷۰
تنظیم کے ذمہ دار حضرات کے لئے چھ روزہ خصوصی تربیت گاہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

فتنہ دجال سے متعلق جو پیشینگوئیاں احادیث مبارکہ میں ملتی ہیں ان میں سے ایک کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ معیشت کے تمام وسائل دجال کے کنٹرول میں ہوں گے اور وہ انسانوں سے کہے گا کہ پہلے کلمۂ کفر زبان سے ادا کرو پھر روٹی کا لقمہ تمہیں مل سکے گا! —— معنوی طور پر پاکستان آج کل اسی صورت سے دوچار ہے۔ ظاہراً حکومت کے ایوانوں سے ملکی معیشت کی صورت حال کے بارے میں خواہ بڑی خوشنما تصویر پیش کی جاتی ہو' ہر واقف حال شخص جانتا ہے کہ ہم بحیثیتِ ملک ایک بدترین معاشی بحران سے دوچار ہیں۔ بیرونی امداد کی طنابیں ہرچہار طرف سے کھینچی جا چکی ہیں۔ آئی ایم ایف ہمیں مزید قرضہ دینے پر کسی طور آمادہ نہیں۔ ملکی ضروریات کو پورا کرنے اور اپنے اللوں تللوں کا کھاتا پورا رکھنے کے لئے ہم محض اس آس کے سہارے دھڑا دھڑ نوٹ چھاپ رہے ہیں کہ آئی ایم ایف سے ہمیں مطلوبہ قرضہ مل جائے گا اور ملکی معیشت کی گاڑی حسب سابق گھسٹتی رہے گی۔ بتانے والے بتاتے ہیں کہ اگر ہمیں مطلوبہ قرضہ نہ مل سکا تو انٹرنیشنل مارکیٹ میں روپے کی قیمت میں یکلخت نمایاں کمی واقع ہو جائے گی اور یہ چیز ہماری ضعیف وناتواں معیشت کی خمیدہ کمر کو مزید دوہرا کرنے کا باعث ہو گی۔

ہمارے وزیر اعظم غیر ملکی سرمایہ کاروں کو اپنے ملک میں سرمایہ کاری پر آمادہ کرنے کے لئے بڑی سرگرمی کے ساتھ مشرق و مغرب کے دورے کر رہے ہیں اور قرضوں کے حصول کے لئے دربدر کی خاک چھان رہے ہیں لیکن انہیں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہو رہی۔ اس لئے کہ قرضوں کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ وفاقی شرعی عدالت کا وہ تاریخ ساز فیصلہ ہے جس کے مطابق بینک کا سود ربا کے حکم میں ہے اور قطعی حرام ہے۔ عالمی سطح پر قرضہ دینے والے تمام اداروں کا اولین مطالبہ یہ ہے کہ وفاقی شرعی عدالت کا یہ فیصلہ واپس لیا جائے جو دراصل ان کے پورے استحصالی نظام سے اعلان بغاوت کا درجہ رکھتا ہے۔ اور اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو ہر نوع کی امداد بند! —— ہماری حکومت ان کے اس مطالبے کی تعمیل میں شرعی عدالت کے فیصلے کے خلاف کورٹ

میں اپیل تو داخل کر ہی چکی ہے' سود کے حق میں اپنے بعض منہ پھٹ وزراء جن میں سردار آصف احمد علی نمایاں ہیں' کے ایسے بیانات کے ذریعے بھی جنہیں تمام مذہبی طبقات نے "کفریہ جملے" قرار دیا ہے' ان عالمی اداروں اور اپنے مائی باپ امریکہ کو مطمئن کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رہی بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر سردار آصف احمد علی نے اب اپنی توپوں کا رخ براہ راست علماء اور مذہبی طبقات کی طرف کر دیا ہے تاکہ اس بنیاد ہی کو کمزور کر دیا جائے جس کے بل پر وفاقی شرعی عدالت کا مذکورہ فیصلہ عوامی حلقوں میں کچھ وزن رکھتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ان عالمی اداروں کی تسلی کے لئے کافی نہیں جنہیں ہم مطمئن کرنا چاہ رہے ہیں۔ ان کی تسلی شاید اس سے کم پر نہیں ہوگی کہ اس تاریخ ساز فیصلے کو مکمل طور پر کالعدم قرار دے دیا جائے اور آئندہ کے لئے ان کی جناب میں صدق دل سے توبہ کی جائے کہ ایسی حرکت کا پھر اعادہ نہیں ہوگا!! ـــــ بصورت دیگر ہمیں فاقہ کشی کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔ لقمہ اسی صورت میں ملے گا جب ہم اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف اعلانِ بغاوت کر کے امریکہ اور آئی ایم ایف کو راضی کریں گے! ـــ حقیقت یہ ہے کہ ہم بحیثیت قوم اس وقت شدید ترین آزمائش سے دوچار ہیں۔ ہمارا ایمان خطرے سے دوچار ہو چکا ہے' بلکہ بحیثیت مجموعی ہم "اَلَا فِی الْفِتْنَۃِ سَقَطُوْا" کے مصداق اس آزمائش میں ناکام ہو چکے ہیں۔ ہاں اگر قوم یونسؑ کی مانند اجتماعی توبہ و استغفار کے ساتھ آئندہ کے لئے اللہ کے ساتھ وفاداری اور اصلاح حال کا عزم مصمم کریں جس کی عملی صورت یہ ہوگی کہ ہم ملک خداداد پاکستان میں "نظام خلافت" یعنی اسلام کے عادلانہ نظام اجتماعی کو بالفعل قائم و نافذ کریں تو اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ حالات میں مثبت تبدیلی آئے گی اور امریکہ اور اس کا نیا ورلڈ آرڈر ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔

کیا ڈر ہے اگر ساری خدائی ہے مخالف کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے!

☆ ☆ ☆

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نیو جرسی (امریکہ) میں ایک کانفرنس میں شرکت کی غرض سے ۲۰ جنوری کو امریکہ کے لئے روانہ ہوئے۔ انہیں وہاں ایک مقامی دینی آرگنائزیشن کی جانب سے مدعو کیا گیا تھا۔ واپسی پر مختصر وقت کے لئے پیرس اور لندن

بھی visit کا پروگرام ہے۔ امیر تنظیم یہ ارادہ لے کر گئے تھے کہ واپسی پر قدرے طویل عرصے کے لئے مکہ میں قیام کریں گے بلکہ رمضان کا اکثر حصہ حرم مکی ہی میں گزارنا ان کے پیش نظر تھا۔ اس اعتبار سے ان کی واپسی وسطِ رمضان کے بعد ہی ممکن ہوگی۔ تاہم وہ اپنے اس ارادے کو کس حد تک روبعمل لاسکیں گے، اس کا علم اللہ ہی کو ہے! وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِہٖ ـــــ امریکہ روانگی سے قبل "تفکر و تذکر" کے زیر عنوان جو کالم انہوں نے روزنامہ "نوائے وقت" کے لئے تحریر کئے ان میں سے ایک میں انہوں نے حالاتِ حاضرہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے بڑی دردمندی کے ساتھ بھارت میں بابری مسجد کو منہدم کرنے کے سنگین واقعے کے حوالے سے مسلمانانِ پاک وہند کی موجودہ صورت حال کا تجزیہ پیش کیا تھا اور دوسرے میں دینی محاذ کے لائحہ عمل پر روشنی ڈالتے ہوئے کچھ عملی تجاویز پیش کی تھیں۔ پاکستان کے موجودالوقت حالات کے اعتبار سے یہ دونوں کالم نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ چنانچہ "ندائے خلافت" کے گذشتہ شمارے میں یہ دونوں یکجا شائع کئے گئے تھے بلکہ جناب زیڈ اے سلہری صاحب وہ پورا کالم بھی شائع کیا گیا تھا جس کا حوالہ محترم ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون "دینی محاذ کا لائحہ عمل" میں ایک سے زائد بار دیا ہے۔ "میثاق" کے چونکہ تمام قارئین تک "ندائے خلافت" نہیں پہنچتا لہٰذا ان دو کالموں میں سے ایک کو تو مکمل صورت میں زیر نظر شمارے میں 'تذکرہ و تبصرہ' کے زیر عنوان شامل کیا گیا ہے۔ دوسرے کالم کے بھی جو سانحہ بابری مسجد کے حوالے سے تھا، بعض منتخب حصے ذیل میں ہدیۂ قارئین کئے جارہے ہیں۔

> " اصل قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ اس حادثۂ فاجعہ کا اصل سبب کیا ہے؟ پھر یہ کہ اس کے مضمرات اور ممکنہ نتائج کیا ہیں؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ع "کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں؟" کے مصداق ان خطرات و خدشات کا کوئی مداوا بھی ہے یا نہیں؟۔ اور ہے تو کیا؟۔
>
> ان میں سے جہاں تک دوسری بات یعنی اس واقعہ کے مضمرات اور ممکنہ نتائج اور عواقب کے مسئلے کا تعلق ہے، اس کا یہ پہلو تو اظہر من الشمس ہے، جس کے لئے کسی گہرے غور و فکر کی چنداں ضرورت نہیں، کہ اس واقعے سے ثابت ہوگیا ہے کہ بھارت میں سیکولرزم کی موت واقع ہو چکی ہے اور اس کا کریا

کرم بھی ہوچکا ہے' اور ہندومت کے جارحانہ احیاء کا طوفان اب اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ بظاہر احوال کوئی طاقت اس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ چنانچہ اس سے قطع نظر کہ خود انڈین نیشنل کانگریس کا سیکولرزم سطحی تھا یا گہرا' اور مصنوعی تھا یا حقیقی' اصل اور اہم بات' جس میں ہرگز کسی شک یا اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رہی' یہ ہے کہ اب اگر کانگریس صدقِ دل سے چاہے تب بھی اس طوفان کے آگے بند نہیں باندھ سکتی۔ اور بھارت کی سیاسی قسمت کم از کم فوری اور قابل دید مستقبل کی حد تک متعصب ہندوؤں کے ساتھ وابستہ ہوگئی ہے۔ البتہ اس حقیقت کی جانب غالباً ابھی کم ہی لوگوں کی توجہ مبذول ہوئی ہے کہ اس کے نتیجے میں بھارت کے بے بس اور لاچار مسلمانوں پر تو ع "جو ہم پہ گذری سو گذری" کے مصداق جو قیامت گذرنے والی ہے وہ گذرے ہی گئی۔ "آسودۂ ساحل تو ہے مگر شاید یہ تجھے معلوم نہیں۔ ساحل سے بھی موجیں اٹھتی ہیں خاموش بھی طوفان ہوتے ہیں!" کے مصداق خود پاکستان پر بھی قیامتِ صغریٰ وارد ہوسکتی ہے اور اس کی پیٹھ پر دسمبر ۱۹۷۱ء کے مانند "عذابِ ادنیٰ" (سورۂ سجدہ آیت ۲۱) کا دوسرا کوڑا بھی پڑسکتا ہے' اور خاکم بدہن' یہ "عذابِ اکبر" یا عذابِ استیصال کی صورت بھی اختیار کرسکتا ہے' جس کے نتیجے میں یہ بچا کھچا پاکستان

(باقی صفحہ ۶۱ پر)

اعلان التواء

سالانہ اجتماع' تنظیم اسلامی

رفقاء تنظیم اسلامی نوٹ فرمالیں کہ تنظیم اسلامی پاکستان کا سالانہ اجتماع جس کے لئے قبل ازیں ۷' ۸ اور ۹ اپریل کی تاریخوں کا اعلان کیا گیا تھا' اب ماہ اکتوبر۔ نومبر تک ملتوی کردیا گیا ہے۔ نئی تاریخوں کا اعلان ان شاء اللہ جلد ہی ہوجائے گا۔

ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان

دینی محاذ کا لائحہ عمل

ڈاکٹر اسرار احمد

بھارت میں بابری مسجد کی تہدیم عصرِ رواں کے اہم ترین واقعات میں سے ہے' اور اس کے بہت دوررس اور دیرپا نتائج کم از کم جنوبی ایشیا کے مستقبل پر تو فوری طور پر مترتب ہوں گے۔ تاہم اس وقت ان سب کا احاطہ مقصود نہیں ہے اور سرِدست اس کے جو دو اہم اثرات پاکستان کی ملکی سیاست اور اجتماعی سوچ کے ضمن میں ظاہر ہوئے ہیں صرف ان کے حوالے سے کچھ عرض کرنا ہے۔

ملکی سیاست کے میدان میں بابری مسجد کی شہادت کا جو فوری نتیجہ برآمد ہوا وہ یہ کہ حکومت اور اپوزیشن کی کشاکش اور محاذ آرائی کی شدت دفعۃً ختم ہوگئی۔ چنانچہ یہ بھی کہا جارہا ہے کہ بابری مسجد کا سانحہ موجودہ حکومت کے حق میں ع عدو شرے برانگیزد کہ خیرِ ما در آں باشد!" کا مصداقِ کامل ثابت ہوا ہے۔ بلکہ بعض لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ پاکستان میں اس کا جو عوامی رد عمل (جو ہرگز پسندیدہ اور دین و شریعت کے اعتبار سے درست نہیں تھا) ظاہر ہوا اسے پیدا کرنے یا کم از کم بھڑکانے میں حکومتی عناصر ہی کا ہاتھ تھا جنہوں نے اس کے ذریعے عوام کی توجہ پی ڈی اے کے لانگ مارچ سے ہٹا دی۔ دوسری طرف یہ بھی کہا جارہا ہے کہ بابری مسجد کا المیہ خود پی ڈی اے کے لئے اپنی مہم کی ناکامی کو چھپانے کا ذریعہ بن گیا ہے۔ ہمیں اس بحث سے تو ہرگز کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ان میں سے کونسی بات درست ہے' البتہ پی ڈی اے کے اس سیاسی ایجی ٹیشن کے ماند پڑ جانے' بلکہ کم از کم وقتی طور پر بالکل ختم ہوجانے کا یہ منطقی نتیجہ ہمارے نقطۂ نگاہ سے بہت اہمیت کا حامل ہے کہ اس کی گہماگہمی کے باعث مذہبی جماعتیں جس طرح ایک دم منظر سے غائب اور پس منظر

میں گم ہوگئی تھیں وہ صورت تبدیل ہوگئی ہے۔ چنانچہ سورۃ الحج کی آیت ۵ میں وارد شدہ تمثیل کے مطابق کہ "تم دیکھتے ہو کہ زمین مردہ پڑی ہوتی ہے لیکن جب ہم اس پر بارش برسادیتے ہیں تو اس میں سرسراہٹ سی پیدا ہوجاتی ہے اور وہ (اپنی روئیدگی کے ذریعے) اپچتی اور اوپر اٹھنے لگتی ہے!" مذہبی جماعتوں کے دھانوں میں بھی پانی پڑتا محسوس ہورہا ہے اور ان کے حلقوں میں بھی حرکت و برکت کے آثار از سرِ نو ہویدا ہورہے ہیں۔ اور یہ ہمارے نزدیک اس اعتبار سے بہت غنیمت ہے کہ چونکہ پی ڈی اے میں خالص اور کھلم کھلا سیکولر عناصر کو فیصلہ کُن غلبہ حاصل ہے لہٰذا اگر اس کی زیرِ قیادت کوئی سیاسی ایجی ٹیشن کامیابی سے ہمکنار ہوجاتا تو اس کے نتیجے میں پاکستان میں ترکی کی طرح کے خالص اور "عریاں" سیکولرزم کے قیام و نفاذ کی راہ ہموار ہوجاتی۔ بہرحال یہ حکومت اور اپوزیشن کے مابین محاذ آرائی کی شدت میں اس کمی ہی کا نتیجہ ہے کہ مذہبی عناصر پھر سیاسی منظر پر نمودار اور متحرک ہوگئے ہیں۔ چنانچہ ایک جانب سینیٹر مولانا سمیع الحق ایک نئے "متّحدہ دینی محاذ" کے قیام کے لئے لنگر لنگوٹا کس کر میدان میں اتر آئے ہیں اور انہوں نے اوپر تلے تین کامیاب کنونشن بھی منعقد کرلئے ہیں جن پر اگرچہ بعض کالم نویس حضرات نے تو نہایت حوصلہ افزا کالم لکھے ہیں تاہم ان کے بارے میں مولانا فضل الرحمٰن کا یہ تبصرہ یقیناً درست ہے کہ یہ مذہبی جماعتوں کے نہیں' صرف مذہبی شخصیتوں کے کنونشن تھے۔ دوسری جانب ایک دوسرے سینیٹر یعنی قاضی حسین احمد نے بھی اپنی صحت یابی کے بعد وارد لاہور ہونے پر اپنے اعزاز میں دئے جانے والے استقبالیہ میں از سرِ نو اتحاد کا نعرہ لگایا ہے۔ حالانکہ آئی جے آئی سے علیحدگی کے بعد جماعت اسلامی کے زعماء یہ کہتے رہے ہیں کہ آئندہ ہم "اتحادوں کی سیاست" سے کنارہ کش رہتے ہوئے خالص اپنی قوت و طاقت کے ذریعے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں گے' یہاں تک کہ متذکرہ بالا استقبالیہ سے ایک ہی دن قبل خود قاضی صاحب کا بھی یہ "مبیّنہ" بیان اخبارات میں شائع ہوچکا تھا کہ اتحادوں کی سیاست ناکام ہوچکی ہے' لہٰذا ہم "اسلامی جمہوری محاذ"

میں شامل نہیں ہوں گے۔ (اپنے اس بیان کی تو قاضی صاحب نے تردید کردی ہے لیکن ان کی غیر حاضری کے دوران اسی قسم کے متعدد بیان قائم مقام امیرِ جماعت خرم مراد صاحب کے بھی شائع ہوئے تھے جن کی کوئی نفی نہیں ہوئی تھی۔)

بابری مسجد کی شہادت کا ایک دوسرا اہم نتیجہ جو پاکستان کی "اجتماعی سوچ" پر مترتب ہوا ہے یہ ہے کہ برعظیم پاک و ہند میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے اعتبار سے پاکستان کا رول از سرنو بحث کا موضوع بن گیا ہے۔ یہاں تک کہ یہ سوال بھی تحت الشعور سے ابھر کر شعور کی سطح پر نمودار ہو رہا ہے کہ آیا پاکستان کا قیام درست بھی تھا یا نہیں؟ اس لئے کہ اِس وقت تو ایسے محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان کو اپنے وجود کا جواز از سرِنو "دریافت" کرنے کی ضرورت پیش آگئی ہے۔ اور اس تلخ تر مسئلے سے قطع نظر کہ موجودہ پاکستان ایک "ثابت و سالم" ملک کی حیثیت سے اپنی آزاد و خود مختار حیثیت کو برقرار بھی رکھ سکے گا یا نہیں، پاکستان کے قائم رہنے کی صورت میں بھی کم از کم فوری طور پر تو وہ بد ترین اندیشے واقعات کا روپ دھارتے نظر آرہے ہیں جو پاکستان کے شدید ترین مخالفین کی جانب سے ظاہر کئے جاتے تھے ___ یعنی: "قیام پاکستان کے نتیجے میں بھارت میں مسلمان ختم ہو جائیں گے اور پاکستان میں اسلام!" اور چونکہ ان خدشات اور خطرات کا ازالہ صرف اس طرح ممکن ہے کہ پاکستان اپنے مذہبی تشخص کو از سرِنو اجاگر کرے اور ع "کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو!" کے مصداق اپنی اصل منزل کا شعور از سرنو تازہ کرے، لہٰذا اس پس منظر میں بھی پاکستان میں علماء دین، مذہبی جماعتوں، اور مسلم فنڈا مینٹلسٹ تحریکوں کا رول زیادہ نمایاں ہوا ہے۔ اور تاریخ نے انہیں ع "پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!" کے مصداق ایک اہم موقع عطا کیا ہے کہ وقت کی نزاکت کے واضح شعور اور حالات کے تقاضوں کے فہم و ادراک کے ساتھ ملک و ملت کی کشتی کو گرداب سے نکالنے میں مؤثر کردار اور بھرپور رول ادا کریں۔ چنانچہ اسی کا ایک اہم مظہر جناب زیڈ اے سلہری کا وہ مضمون ہے جو حال ہی میں "دینی محاذ

کی ضرورت کیوں؟" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔

سلہری صاحب پاکستان کے معمر ترین اور سینئر موسٹ صحافیوں میں سے ہیں اور قائداعظم کے شیدائی ہونے کے ساتھ ساتھ کٹر مسلم لیگی اور سچے پاکستانی ہونے کے ناتے پاکستان کی اساس یعنی "مسلم قومیت" کے ساتھ ان کی وابستگی "وفاداری بشرطِ استواری" کے جملہ معیارات پر پوری اترتی ہے۔ پھر ان کی نگاہ جہاں پاکستان کے ماضی اور تحریک پاکستان کے اصل محرکات پر تو پوری طرح ہے ہی' وہاں وہ موجودہ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات اور ان کے تقاضوں سے بھی ع "عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں!" کے مصداق اچھی طرح باخبر ہیں۔ اور الحمدللہ کہ ان کے خیالات میں جو ارتقائی تبدیلی کچھ عرصہ سے پروان چڑھ رہی تھی وہ ان کی حالیہ تحریر میں خاصی بلوغت کو پہنچی نظر آتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس میں جہاں ایک جانب یہ واضح اعلان کیا ہے کہ : "ہمارا تشخص مسلم قومیت سے وابستہ ہے جس کی بنیاد اسلام ہے!" وہاں اس سے آگے بڑھ کر غیر مبہم الفاظ میں یہ اعلان بھی کیا ہے کہ : "درحقیقت مسلمانانِ برصغیر نے مسلم قومیت کی بنیاد پر ملک بنا کر ایک بہت بڑے انقلاب کا بوجھ اٹھایا ہے اور ہم اس کی حقانیت کو نظامِ اسلام کے نفاذ ہی سے عملی طور پر ثابت کرسکتے ہیں اور اس مرحلے سے ابھی عہدہ برآ ہونا باقی ہے!"

مزید برآں اپنی اس تحریر میں سلہری صاحب نے اسلامی نظام کے عملی نفاذ کے سلسلے میں پاکستان کی جملہ قومی سیاسی جماعتوں سے کامل مایوسی کا اظہار بھی برملا طور پر کردیا ہے۔ چنانچہ پیپلزپارٹی کا تو ذکر ہی کیا کہ وہ تو ہے ہی کھلم کھلا سیکولر جماعت' انہوں نے کٹر مسلم لیگی ہونے کے باوجود نہ صرف موجودہ نام نہاد آئی جے آئی کی حکومت بلکہ خود مسلم لیگ سے بھی اپنی کامل مایوسی کا ببانگِ دہل اعلان کرتے ہوئے علماء کرام اور مذہبی جماعتوں کو دعوت دی ہے کہ وہ آگے آئیں اور ع "ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!" کے مصداق اپنا فرض منصبی ادا کریں۔

راقم الحروف کو نہ صرف یہ کہ سلہری صاحب کے اس تجزیئے سے صد فی صد

اتفاق ہے بلکہ یہ احساس بھی ہے کہ ہمارے لئے مہلتِ عمل بھی بہت ہی کم باقی رہ گئی ہے اور اگر تین چار سالوں کے اندر اندر یہاں اسلامی انقلاب برپا نہ ہوا تو نہ صرف یہ ملک "تحلیل" ہوجائے گا' بلکہ یہ' خاکم بدہن' پورے بر عظیم ہند و پاک سے بالکل سپین کے مانند اسلام اور مسلمان دونوں کے کامل خاتمے کی تمہید ہوگی۔ اور مستقبل کا مؤرخ "خونِ دو عالم میری گردن پر!" کے مصداق اس کی پوری ذمہ داری تحریک پاکستان اور اس کے زعماء و قائدین پر عائد کرے گا!۔۔۔ لیکن اصل قابل غور مسئلہ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام و نفاذ کے طریق کار اور اسلامی انقلاب کے منہج و منہاج کا ہے' جس کے واضح شعور اور صحیح ادراک کے بغیر اس مہم کا سر ہونا محال ہے!

اس سلسلے میں راقم کی مستقل اور سوچی سمجھی رائے تو یہ ہے کہ یہ عظیم مقصد ایک ایسی منظم جماعت کے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا جس میں ایک معتدبہ تعداد میں ایسے لوگ شامل ہوں جو خود اپنی ذاتی اور خانگی زندگی میں شریعتِ اسلامی پر بالفعل عمل پیرا ہوں' اور ایک امیر سے "سمع و طاعت فی المعروف" کی بیعت کے رشتے میں منسلک ہو کر تن من دھن قربان کرنے پر تیار ہوجائیں۔ چنانچہ ایک ایسی جماعت کے قیام کے لئے ہی راقم نے ایک عرصہ سے اپنی پوری سعی و جہد کو وقف کیا ہوا ہے' تاہم حالات کی سنگینی اور وقت کی نزاکت کے پیش نظر راقم کا مشورہ یہ ہے کہ فوری طور پر تمام دینی اور مذہبی جماعتیں اور جملہ اہم دینی و روحانی شخصیتیں دو محاذوں کی صورت میں منظم ہوجائیں جن میں سے ایک "دینی سیاسی محاذ" ہو جس میں وہ تمام جماعتیں شریک ہوجائیں جو ملکی انتخابات میں حصہ لے کر سیاسی عمل کے ذریعے نفاذِ اسلام کے لئے زور لگائیں' اور دوسرا "اسلامی انقلابی محاذ" ہو جو خالص مزاحمتی تحریک (رزسٹنس موومنٹ) کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے اور اس کے سلسلے میں "بِاللّسان" یعنی وعظ و نصیحت سے آگے بڑھ کر مناسب قوت فراہم ہونے پر "بِالید" یعنی قوت کے ساتھ بدی کے

استیصال کے لئے کمربستہ ہوجائے اور منظم اور پرامن احتجاجوں' مظاہروں اور ہڑتالوں کے ذریعے غیر اسلامی اور ظالمانہ نظام کا راستہ روکتے ہوئے بالآخر رسول نافرمانی اور سرکاری محصولات کی عدم ادائیگی کے ذریعے انقلاب برپا کردے!

لیکن اس تجویز کی کامیابی کی شرطِ لازم یہ ہے کہ ان دونوں محاذوں کے مابین لائحہ عمل اور دائرہ ہائے کار کی تقسیم بھی بالکل واضح اور ہر اعتبار سے شک اور شبہ سے بالاتر ہونی چاہئے اور ان دونوں کے تنظیمی ڈھانچے بھی اپنی اپنی جگہ واضح اور معیّن ہونے کے ساتھ ساتھ' واضح طور پر ایک دوسرے سے جدا ہونے ضروری ہیں' یہاں تک کہ ان کی قیادت بھی بالکل علیحدہ ہونی لازمی ہے۔ اس لئے کہ ان دونوں کاموں کے تقاضے بالکل مختلف ہی نہیں ایک دوسرے کی کامل ضد ہیں۔ چنانچہ سیاسی اور انتخابی عمل میں "سکہ ہائے رائج الوقت" کا مناسب حد تک استعمال' اور "مقاصد ذرائع کو جواز عطا کردیتے ہیں!" کے اصول کا ایک حد تک لحاظ ضروری ہے۔ اور ع "چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے!" کے مصداق تقویٰ' تدیّن' اصول پرستی' اور رزقِ حلال ایسے اعلیٰ چراغ ہاتھ میں لے کر موجودہ سیاسی آندھیوں کے میدان میں اترنا دنیوی اور عملی اعتبار سے تو یقیناً سعی لا حاصل ہے' صرف اخروی اجر و ثواب کا حصول پیش نظر ہو تو بات دوسری ہے! جبکہ دوسرے یعنی انقلابی عمل کے تو اصل اوزار اور ہتھیار ہی یہ ہیں اور ان کے بغیر اس میدان میں کامیابی تو کجا کسی قابلِ لحاظ پیش قدمی کا تصور تک ناممکن ہے!

یہ شرط اگر واضح طور پر پوری ہوجائے تو یہ دونوں محاذ ایک دوسرے کی تقویت کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اور ان کے مابین تعاون کی نہایت مؤثر صورتیں بھی پیدا ہوسکتی ہیں۔ جبکہ بصورتِ دیگر اگر ان کے مابین طریق کار کے ضمن میں زبان پر انقلاب اور عمل میں سیاست کی دوعملی برقرار رہی تو جو مختصر سی مہلتِ عمل ہمیں حاصل ہے وہ۔

"اسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی، کبھی پیچ و تابِ رازی!"

کے مصداق گذر کر رہ جائے گی۔ اور منزل کی جانب کوئی پیشقدمی نہیں ہو سکے گی، جس کے ہولناک نتائج کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

اس پس منظر میں جمعیت علماء اسلام (مولانا فضل الرحمٰن گروپ) اور جمعیت علماء پاکستان (مولانا نورانی گروپ) پر مشتمل "اسلامی جمہوری محاذ" وسیع تر اسلامی سیاسی اتحاد کا نقطۂ آغاز بن سکتا ہے۔ اور راقم نے تو اس کے قیام کو اس اعتبار سے بھی خوش آمدید کہا تھا کہ اگر اس کے ذریعے سیاسی میدان میں کوئی عملی پیشقدمی نہ ہو سکے لیکن دیوبندی بریلوی تلخی ہی میں کچھ کمی واقع ہو جائے تب بھی گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ اب ضرورت ہے کہ وہ تمام جماعتیں اور شخصیتیں جو انتخابی عمل کے ذریعے اسلام کی خدمت کا داعیہ رکھتی ہوں انہیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے اور انانیت کو ختم کرتے ہوئے ع "قبائل ہوں ملّت کی وحدت میں گم!" کے مصداق ایسے کسی محاذ میں صرف شامل ہی نہیں مدغم ہو جانا چاہئے۔

باقی جماعت اسلامی ہو یا جمعیت علماء اسلام (سمیع الحق گروپ) یہ اگر کوئی اور اتحاد قائم کرنا چاہیں تو "اسلامی انقلابی محاذ" کا میدان نہ صرف یہ کہ کھلا ہوا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ "جا ایں جاست!" کے مصداق اسلامی نظام کے قیام کی جنگ اصلاً اسی میدان میں لڑی جائے گی اور اس محاذ پر ایک مؤثر طاقت کے ظہور کے بغیر اس عظیم مقصد کا حصول ناممکن ہے! چنانچہ ان میں سے جو جماعت بھی انتخابی سیاست سے کامل کنارہ کشی کا اعلان کر کے خالص رزسٹنس موومنٹ کی حیثیت سے کام کرنے کا اعلان کرے وہ راقم الحروف اور اس کی مختصر سی تنظیم کو اپنا ادنیٰ خادم پائے گی!

باقی رہے اہل حدیث اور اہل تشیع، تو اگر انہیں واقعتاً اپنے اپنے مسلکوں سے زیادہ "اسلام" عزیز اور مطلوب ہے، تو ان کے اکابر کو اپنی ذاتی انا کے ایثار کے ساتھ ساتھ اپنے مسلک کے ضمن میں بھی کسی قدر لچک اور قربانی کی راہ اختیار کرنی پڑے

گی۔ اس سلسلے میں انہیں وقت اور مسئلے کی نزاکت کا احساس کرنا چاہئے اور سوچنا چاہئے کہ اگر خدانخواستہ پاکستان ہی باقی نہ رہا' یا اگر باقی تو رہا لیکن یہاں خالص سیکولر نظام قائم ہوگیا تو خود ان مسلکوں کو کیا حاصل ہوگا؟ ان میں سے اہل حدیث حضرات کا معاملہ اس اعتبار سے آسان ہے کہ مسلکِ حنفی میں بھی تو حدیث کے اُن ہی مجموعوں کو مستند اور مستدل مانا جاتا ہے جو آپ کے نزدیک معتبر ہیں' اور اہلِ تشیع کے لئے معاملہ اس اعتبار سے زیادہ قابل غور ہے کہ اِس وقت پوری دنیا میں اگرچہ مسلم فنڈا مینٹلسٹ عوام اور جماعتیں تو تمام مسلمان ملکوں میں موجود ہیں لیکن حکومتی اور سرکاری سطح پر واحد فنڈا مینٹلسٹ ملک ایران ہے۔ اور وہاں کا نعرہ ہی یہ ہے کہ "لَاشَرقِیَّہ' لَاغَربِیَّہ - اِسلامِیَّہ' اِسلامِیَّہ!" اور "لَاشِیعِیَّہ' لَا سُنِّیَّہ - اِسلَامِیَّہ' اِسلَامِیَّہ!"—— اس کا تقاضا ہے کہ پاکستان کے اہلِ تشیع بھی عملاً خالص سیکولر عناصر کا ساتھ چھوڑ کر وہ راہ اختیار کریں جس سے پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کی راہ ہموار ہوسکے' یعنی پرسنل لاء میں مکمل آزادی کے ساتھ پبلک لاء اور قانونِ ملکی میں اکثریت کے مسلک کو تسلیم کرنے کا وہی فارمولا اختیار کرلیں جو ایران میں اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک قدم تو انہوں نے بحمد اللہ اٹھا ہی لیا ہے یعنی "تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ" میں سے "نفاذ" کا لفظ حذف کردیا ہے۔ اب ذرا مزید ہمت کریں اور ایک قدم مزید اٹھالیں—— اور پھر اہل حدیث بھی طے کرلیں اور اہل تشیع بھی کہ "اسلامی سیاسی محاذ" پر برسرِ عمل ہونا ہے یا "اسلامی انقلابی محاذ" پر!

برائے توجہ!

اطلاعاً عرض ہے کہ بیرون پاکستان ڈاک خرچ کی شرح میں غیر معمولی اضافے کی بناء پر یکم فروری ۹۳ء سے ماہنامہ "میثاق" کے سالانہ زرِ تعاون برائے بیرون پاکستان کی شرح میں بھی اسی نسبت سے اضافہ کیا گیا ہے۔ اضافہ شدہ شرح "میثاق" کے لوح کے صفحے پر درج کردی گئی ہے۔

منیجر

اسلام میں عدل اجتماعی کی اہمیت

ڈاکٹر اسرار احمد

جس طرح علامہ اقبال نے فریاد کی تھی کہ "مرا یاراں غزلخوانے شمردند!" یعنی مجھ پر میرے دوستوں نے یہ شدید زیادتی کی ہے کہ مجھے بھی بس ایک غزل گو شاعر سمجھ لیا ہے ـــــ اسی طرح واقعہ یہ ہے کہ اسلام پر جو سب سے بڑا ظلم ہوا وہ یہ ہے کہ اسے محض ایک "مذہب" بنا کر رکھ دیا گیا۔ حالانکہ وہ مذہب نہیں "دین" ہے۔

چنانچہ قرآن مجید کے بارے میں یہ بات تو قطعی اور حتمی طور پر معلوم ہے کہ اس میں اسلام کے لئے کہیں بھی مذہب کا لفظ استعمال نہیں ہوا' زیادہ قابلِ توجہ بلکہ حیران کُن امر یہ ہے کہ اگرچہ قرآن نے "مذہب" کے قبیل کے دوسرے متعدد الفاظ مثلاً شریعت اور طریقت وغیرہ استعمال کئے ہیں لیکن مذہب کا لفظ پورے قرآن میں سرے سے کہیں بھی وارد نہیں ہوا۔ اب اسے خواہ قسمت کی ستم ظریفی کہیں' خواہ اغیار کی "عیاری" اور اپنوں کی "سادگی" قرار دیں' (ع "سادگی اپنوں کی دیکھ' اوروں کی عیاری بھی دیکھ"۔ اقبال) خواہ "دیوانہ بکارِ خویش ہشیار" اور ـ "تپتی راہیں مجھ کو پکاریں۔ دامن پکڑے چھاؤں گھنیری" کے مطابق "دین" کی بھاری ذمہ داریوں سے بچنے اور اقامتِ دین اور غلبۂ دینِ حق کے لئے جہاد و قتال کی "تپتی راہوں" سے فرار' اور "مذہب" کی "گھنیری چھاؤں" میں پناہ لینے کی کوشش کا مظہر قرار دیں' بہرحال واقعہ یہ ہے کہ عالمِ اسلام سمیت پوری دنیا میں اسلام کے لئے سب سے زیادہ استعمال ہونے والا لفظ مذہب ہے۔

عرف عام کے اعتبار سے "مذہب" انگریزی لفظ "Religion" کا ترجمہ ہے

اور عہدِ حاضر میں اس کے ساتھ یہ تصور لازم وملزوم کے مانند چسپاں ہوچکا ہے کہ یہ انسان کا انفرادی معاملہ ہے اور اس کا دائرہ صرف عقائد' عبادات' پیدائش و وفات کی رسومات اور شادی بیاہ اور تہواروں کی تقریبات تک محدود ہے' چنانچہ سماجی' معاشی اور سیاسی نظام اور قانون ملکی کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اجتماعیاتِ انسانی کے یہ تمام گوشے سیکولر دائرے سے تعلق رکھتے ہیں' (یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عظیم ترین انسان قرار دینے کی وجہ یہ بیان کی کہ "وہ یعنی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پوری نسلِ انسانی کے واحد فرد ہیں جو حیاتِ انسانی کے مذہبی اور سیکولر دونوں دائروں میں نہایت کامیاب ہیں") جبکہ اس کے برعکس دین ہونے کے ناطے اسلام حیاتِ انسانی کو ایک وحدت اور اکائی قرار دے کے اس کے تمام شعبوں اور پہلوؤں پر اللہ کی حاکمیت کا نفاذ چاہتا ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ جب اسلام آزاد اور غالب ہوتا ہے تب ہی وہ "دین" ہوتا ہے اور جب وہ محکوم اور مغلوب ہوجاتا ہے تو۔

"بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی!"

کے مصداق "مذہب" بن کر رہ جاتا ہے۔ اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ آپؐ نے بیس سالہ انقلابی جدوجہد کے نتیجے میں اسلام کو بحیثیتِ دین غالب و قائم کر دیا' اور مذہبی اور سیاسی دونوں میدانوں میں اللہ کی حکمرانی کا پرچم لہرادیا!

اسلام کے "دین" سے "مذہب" کی جانب تنزل کے عمل کا آغاز تو خلافتِ راشدہ کے خاتمے کے فوراً بعد ہی ہوگیا تھا جب حکومت و سیاست کی بلند ترین سطح سے اسلام کو بے دخل کر دیا گیا تھا۔ تاہم ہزار بارہ سو برس تک حدیث نبویؐ میں وارد شدہ اصطلاح کے مطابق "کاٹ کھانے والی (یعنی ظالم) ملوکیت" کے تحت بھی کم از کم قانون کی سطح پر شریعتِ اسلامی کی عملداری برقرار رہی۔ لیکن اب سے تقریباً دو

سو سال قبل یہ عمل اپنی پوری شدت اور اپنے آخری "نقطۂ زوال" کو پہنچ گیا جب حدیث نبوی کی اصطلاح میں "مُلکاً جَبریًّا" یعنی غیر مسلموں کی غلامی کا دور شروع ہوگیا اور اسلام کی عملداری قانونِ ملکی سے بھی ختم ہوکر صرف عقائد و عبادات اور احوالِ شخصیہ تک محدود ہوکر رہ گئی۔ لیکن اس معاملے کا افسوس ناک ترین پہلو یہ ہے کہ عام مسلمانوں ہی نے نہیں' بڑے بڑے علماء نے بھی اس صورت حال کو "ذہناً" قبول کرلیا' یہاں تک کہ ماضی قریب میں بعض نامور علماء نے یہ تک کہا کہ ہمیں چاہئے کہ ایسا کوئی کام نہ کریں جس سے ہمارے حکمرانوں (یعنی انگریزوں) کو پریشانی لاحق ہو' اس لئے کہ انہوں نے ہمیں "مذہبی آزادی" دے رکھی ہے۔ چنانچہ اسی پر پھبتی چست کی تھی علامہ اقبال نے کہ ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

اور اگرچہ اِس وقت طبقۂ علماء کی اکثریت اور ان کے زیر اثر عوام کے ذہنوں میں اسلام کا یہی "مذہبی تصور" جاگزیں ہے' تاہم اللہ کا شکر ہے کہ گذشتہ پون صدی کی احیائی مساعی کے نتیجے میں اُمّت کے ایک قابلِ لحاظ حصے میں یہ حقیقت از سرِنو واشگاف ہوگئی ہے کہ اسلام صرف مذہب نہیں' دین ہے! فلہ الحمد و المنہ!!

دین کی حیثیت سے اسلام کی اعلیٰ ترین قدر' اس کا آخری ہدف' اور اصل مقصود و مطلوب عدلِ اجتماعی یعنی سماجی انصاف یا سوشل جسٹس ہے جس کے تین نمایاں ترین مظاہر ہیں: (۱) سماجی اور قانونی سطح پر کامل مساوات (۲) سیاسی سطح پر حریت اور (۳) معاشی سطح پر عدل و انصاف۔ چنانچہ اسلام ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں نہ معاشرتی میدان میں اونچ نیچ اور ادنیٰ و اعلیٰ کا امتیاز ہو' نہ سیاسی میدان میں جبر و استبداد کا راج اور بندہ و آقا' حاکم و محکوم اور مستکبرین اور مستضعفین کی تقسیم ہو' نہ اقتصادی میدان میں انسان ظلم اور استحصال کے باعث HAVES اور HAVE NOTS یعنی مترفین و محرومین میں منقسم ہوں!

یہاں ایک وضاحت مناسب ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات کو خیال آئے کہ اسلام کی اعلیٰ ترین اقدار تو تقرب الی اللہ اور تعلق مع اللہ یعنی بندہ اور رب کے مابین خلوص و اخلاص اور باہمی محبت و ولایت کا رشتہ ہے! تو اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ واقعہ یہی ہے کہ اسلام انفرادی سطح پر بندۂ مومن کو جو اعلیٰ ترین نصب العین عطا کرتا ہے وہ رضائے الٰہی اور فلاحِ اخروی کا حصول ہے' لیکن اس حقیقت سے صرفِ نظر کرلینا بھی شدید قسم کی بے حسی اور نا انصافی کے بغیر ممکن نہیں کہ جس خطۂ ارضی میں نظامِ اجتماعی ظالمانہ اور استحصالی ہو وہاں کے لوگوں کی عظیم اکثریت کولہو کے بیلوں اور باربرداری کے جانوروں کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے اور فرمانِ نبویؐ "قریب ہے کہ فقر و احتیاج کفر کی صورت اختیار کرلیں!" اور قولِ شاعر ؎ "دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا۔ تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے!" کے مصداق ان میں نہ اتنا شعور باقی رہ جاتا ہے کہ اپنے خالق و مالک کی معرفت حاصل کر سکیں' نہ اتنی فرصت ہی حاصل ہوتی ہے کہ ع "بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے!" کے مصداق اسے یاد کرسکیں یا اس سے لو لگا سکیں! اس سلسلے میں امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا یہ قول آبِ زر سے لکھنے کے قابل اور لوحِ قلب و ذہن پر نقش کے لینے کا مستحق ہے کہ تقسیمِ دولت کا غیر منصفانہ نظام ایک دو دھاری تلوار ہے جو معاشرے کو دونوں جانب سے کاٹتی ہے کیونکہ اس کے نتیجے میں ایک جانب ایک محدود طبقے میں دولت کا ارتکاز ہو جاتا ہے جس سے عیاشی اور بداخلاقی جنم لیتی ہے' اور دوسری جانب فقر و احتیاج کا دَور دورہ ہوجاتا ہے جس سے انسان ڈھور ڈنگر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں! بنابریں خانقاہی نظام کے برعکس' جو مجاہدۂ نفس اور ریاضت و مراقبہ ہی کو مقصود و مطلوب بنالیتا ہے' اسلام نے اپنا "زروۂ سنام" یعنی چوٹی کا عمل جہاد فی سبیل اللہ کو قرار دیا ہے جس کا اصل ہدف ہے: قیامِ نظامِ عدلِ اجتماعی اور ظلم و جبر اور استحصال اور استبداد کا خاتمہ!!

اسلام میں اس عدلِ اجتماعی' یا سماجی انصاف یعنی سوشل جسٹس کو جو اہمیت

حاصل ہے اس کا اندازہ اس مسئلے میں قرآن حکیم کی عام تعلیمات پر مستزاد ان تصریحات کے جائزہ سے بآسانی کیا جا سکتا ہے جو تین اعلیٰ ترین سطحوں یعنی ایمان باللہ' ایمان بالرسالت' اور امتِ مسلمہ کے فرائضِ منصبی کے ضمن میں وارد ہوئی ہیں:۔

۱) اسلام کی اصل اساس ایمان باللہ ہے' اور ایمان باللہ اور معرفتِ الٰہی کا واحد ذریعہ اللہ کے اسماء و صفات ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماءِ حسنیٰ کی تفصیل پر مشتمل جو حدیث امام ترمذیؒ اور امام بیہقیؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے اس میں اللہ تعالیٰ کا ایک نامِ نامی اور اسمِ گرامی "العدل" بھی ہے۔ یعنی سراپا عدل اور مجسم انصاف۔ قرآن حکیم میں اگرچہ اللہ تعالیٰ کا یہ نام تو وارد نہیں ہوا' تاہم متعدد مقامات پر اس کی اس شان کا ذکر موجود ہے مثلاً: (i) "اللہ فیصلہ کرتا ہے حق کے ساتھ"۔۔۔ سورۃ المومن: ۲۰ (ii) "تیرے رب کی بات صِدق و عَدل کے جملہ معیارات کے مطابق پوری ہو چکی ہے"۔۔۔ سورۃ الانعام: ۱۱۵ (iii) "خود اللہ بھی گواہ ہے اور سب فرشتے اور تمام اہلِ علم بھی گواہ ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جو عدل و انصاف کو قائم کرنے والا ہے"۔۔۔ سورہ آل عمران: ۱۸ (iv) "اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے"۔۔۔ سورۃ المائدہ' سورۃ الحجرات اور سورۃ الممتحنہ

۲) ایمان باللہ کے بعد درجہ اور مرتبہ ہے ایمان بالرسالت یعنی بعثت انبیاء و رُسل اور انزالِ کتاب و شریعت پر یقین کا۔ چنانچہ یہ بات بھی قرآن حکیم نے نہایت واشگاف الفاظ میں واضح کر دی ہے کہ ان جملہ امور کا اصل مقصد یہ کہ "انسان عدل و انصاف پر قائم ہوں"۔

اس اہم موضوع پر قرآن حکیم کی سب سے زیادہ "انقلابی آیت" سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ ہے جس کے بارے میں بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اتنے مختصر الفاظ میں اس قدر جامع اور اتنی بھرپور اور گھمبیر انقلابی عبارت کی کوئی دوسری مثال دنیا کے پورے انقلابی لٹریچر میں کہیں نہیں مل سکتی۔ اس آیۂ مبارکہ کا ترجمہ بعض تشریحی اضافوں کے ساتھ یوں ہوگا:

"یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو روشن نشانیوں (یعنی معجزات و براہین) کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ اپنی کتاب بھی نازل فرمائی اور میزان بھی' تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں اور (جو لوگ اس میزان عدل کے نصب کرنے میں رکاوٹ بنیں' ان کی سرکوبی کے لئے) ہم نے لوہا اتارا جس میں (حرب وضرب) کی شدید قوت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کے لئے (کچھ دوسرے) فائدے بھی ہیں۔ اور (اس سے اللہ کا اصل مقصد یہ ہے) کہ اللہ (ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کو آزمائے اور یہ) دیکھے کہ کون ہیں جو (لوہے کی حربی قوت کے استعمال کے ذریعے) مدد کرتے ہیں اس کی اور اس کے رسولوں کی غیب میں ہوتے ہوئے' (ورنہ) یقیناً اللہ (خود) نہایت زور آور اور مختارِ مطلق ہے"!

اس آیۂ مبارکہ نے نہایت واشگاف الفاظ میں واضح کردیا ہے کہ:

اولاً ـــــ شریعتِ خداوندی کی اصل حیثیت ایک میزانِ عدل وقسط کی ہے جس میں انسانوں کے انفرادی اور اجتماعی حقوق و فرائض تولے جانے چاہئیں۔

ثانیاً ـــــ بعثتِ انبیاء و رسل اور نزولِ وحی و کتب سے آخری مطلوب یہ ہے کہ اللہ کی عطا کردہ میزانِ عدل وقسط بالفعل نصب ہو اور جسے کچھ ملے اس میں تل کر ملے اور جس سے کچھ لیا جائے اس میں تول کر لیا جائے اور اگر یہ مقصد حاصل نہ ہو تو "گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں!" کے مصداق رسولوں کے ساتھ عشق و محبت کے دعوے باطل اور کتابِ الٰہی کی تلاوت و قراءت کا ذوق و شوق بے مقصد ہوجاتا ہے۔

ثالثاً ـــــ اس میزانِ عدل و قسط کو عملاً نصب کرنے کے ضمن میں جہاں اصل کام دعوت و تبلیغ' وعظ و تلقین' انذار و تبشیر اور ترغیب و ترہیب سے لیا جائے گا وہاں قوت و طاقت کا استعمال بھی قطعاً غلط یا مطلقاً ناجائز نہیں' بلکہ حسب ضرورت نہ صرف جائز بلکہ بعض صورتوں میں فرض اور واجب ہوجاتا ہے۔

رابعاً ـــــ جس طرح انسان کی حیاتِ دنیوی کا اصل مقصد از روئے قرآن ابتلاء و آزمائش ہے جیسے کہ وارد ہوا سورۃ الملک کی آیت نمبر۲ میں جس کی ترجمانی کی ہے ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال نے اپنے اس حکیمانہ شعر میں کہ ۔

"قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!"

اسی طرح انبیاء ورسل کی بعثت اور کتاب و شریعت کے نزول کا مقصد ان لوگوں کے خلوص اور صداقت کا امتحان ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان کے دعوے دار ہوں کہ آیا وہ اللہ کی عطا کردہ میزانِ عدل کو بالفعل نصب کرنے اور اسلام کے نظامِ عدل وقسط کو عملاً قائم کرنے میں تن من دھن کھپاتے حتیٰ کہ وقت آنے پر نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آجاتے ہیں یا نہیں!

خامساً ـــــ وہ صاحب ایمان جو اس امتحان میں پورے اتریں اللہ کے نزدیک بلند ترین مقام و مرتبہ کے مستحق ہوں گے' یہاں تک کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے "مددگار" قرار پائیں گے۔

قرآن حکیم کے طالب علم جانتے ہیں کہ اس کتابِ عزیز کا ایک مستقل اصول یہ ہے کہ اس میں اہم مضامین کم از کم دو مرتبہ ضرور آتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ الحدید کی اس آیت ۲۵ کی طرح سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۷ میں بھی کتاب و میزان کا ذکر یکجا وارد ہوا ہے اور اس سے قبل آیت ۱۵ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے ع "مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ" کے انداز میں کہلوایا گیا ہے کہ "مجھے حکم ہوا ہے کہ تمہارے مابین عدل قائم کروں!" ـــــ اسی طرح اللہ اور اس کے رسولؐ کی نصرت کا ذکر جس انداز میں سورۃ الحدید کی اس آیت کے آخر میں آیا ہے' بالکل اسی طرح سورۃ الصف کی آخری آیت میں بھی وارد ہوا ہے! اور ذہن میں تازہ کر لیجئے کہ سورۃ الصف کی مرکزی آیت وہی ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت یہ بیان ہوا ہے کہ جو دینِ حق یعنی نظامِ عدل وقسط آپؐ کو

دے کر بھیجا گیا ہے اسے پورے نظامِ زندگی پر بالفعل قائم کردیں۔

۳) نبی اکرمؐ پر نبوت کا سلسلہ ختم ہوجانے کے بعد اب قیامت تک رسالت کے مشن کی تکمیل اور فرائضِ رسالت کی ادائیگی کی ذمہ داری امتِ مسلمہ پر بحیثیتِ مجموعی عائد ہوگئی ہے۔ اس کے ضمن میں قرآن حکیم میں جہاں سورۃ الحج کی آخری آیت اور سورۃ البقرہ کی آیت ۱۴۳ میں "شہادت علی الناس" کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے، اور سورہ آل عمران کی آیت ۱۰۴ اور ۱۱۰ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے الفاظ وارد ہوئے ہیں وہاں سورۃ النساء کی آیت ۱۳۵ اور سورۃ المائدہ کی آیت ۸ میں ذرا سی لفظی ترتیب کے فرق کے ساتھ عدل و قسط کی گواہی اور نظامِ عدل و قسط کو قائم کرنے کے لئے پوری قوت کے ساتھ کھڑے ہوجانے کا تاکیدی حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ النساء میں ارشاد ہوا: (ترجمہ) "اے اہلِ ایمان! پوری قوت کے ساتھ عدل وقسط کے قائم کرنے والے اور اللہ کے حق میں گواہی دینے والے بنو خواہ یہ گواہی تمہارے اپنے خلاف جارہی ہو!" ـــــ اور سورۃ المائدہ میں فرمایا: (ترجمہ) "اے ایمان والو! پوری قوت کے ساتھ اللہ کے لئے کھڑے ہوجاؤ عدل و قسط کی گواہی دیتے ہوئے، اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرنے پائے کہ تم عدل سے انحراف کرو، ہر حال میں عدل سے کام لو، یہی تقویٰ سے قریب تر ہے!"

۴) اس مضمون کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ قرآن مظلوم اور محروم طبقات کو صرف صبر ہی کی تلقین نہیں کرتا بلکہ انتقام لینے کی اجازت بھی دیتا ہے۔ چنانچہ انفرادی سطح پر تو سورۃ النساء کی آیت ۱۴۸ کے یہ الفاظ کفایت کرتے ہیں کہ (ترجمہ) "اللہ کو بُری بات بلند آواز سے کہنا بالکل پسند نہیں، سوائے اس کے جس پر ظلم ہوا ہو!" ـــــ اور اجتماعی سطح پر یہ نہایت واشگاف الفاظ میں فرمائی گئی ہے سورۃ الشوریٰ کی آیت ۳۹ میں ایسے لوگوں کا ذکر مدح و ستائش کے انداز میں کرکے "جن پر ظلم اور زیادتی کی جائے تو وہ اس کا بدلہ اور انتقام لیتے ہیں!" اور پھر آیات ۴۱ اور ۴۲ میں ان تصریحات کے ذریعے کہ (ترجمہ) "جو کوئی انتقام لیتا ہے اس کے بعد کہ اس پر ظلم کیا گیا ہو تو

ایسے لوگوں پر نہ کوئی الزام ہے نہ ملامت، الزام اور ملامت کے قابل تو وہ ہیں جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں (یعنی ان کے سماجی، سیاسی اور معاشی حقوق غصب کرتے ہیں) اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں (یعنی مستکبرین اور مترفین کی صورت اختیار کر لیتے ہیں) ایسے ہی لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے!"— ان اختتامی الفاظ میں گویا کہ اشارہ موجود ہے کہ ان ظالموں اور مستکبرین کو آخرت میں تو سزا ملے ہی گی دنیا میں بھی نہ صرف یہ کہ ان کے ہاتھ روکنے کی بھرپور سعی ہونی چاہئے بلکہ ضرورت پیش آئے تو سورۃ البقرہ کی آیت ۱۷۹ میں وارد شدہ الفاظ "اے ہوشمندو تمہارے لئے قصاص ہی میں زندگی ہے!" کے مطابق ایسے لوگوں کو بھرپور سزا دینے حتیٰ کہ ان کی سرکوبی کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جانا چاہئے!

حاصلِ کلام یہ ہے کہ بحیثیتِ دینِ اسلام کی اعلیٰ ترین قدر سماجی اور تمدنی انصاف ہے اور اقامتِ دین یعنی اسلامی انقلاب کا اصل ہدف یہ ہے کہ اللہ کا عطا کردہ متوازن اور معتدل نظامِ عدلِ اجتماعی (سسٹم آف سوشل جسٹس) قائم کیا جائے!

آخر میں عربی زبان کے اس مقولے کے مطابق کہ "اصل فضیلت اور خوبی وہ ہے جس کا اعتراف دشمن بھی کریں!" ایک شاتمِ رسولؐ کی گواہی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میری مراد ایچ جی ویلز سے ہے جس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی اور ازدواجی زندگی پر نہایت رکیک حملے کئے ہیں لیکن اس نے بھی اپنے آپ کو اس عدلِ اجتماعی کے حوالے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شاندار ہدیۂ تحسین پیش کرنے پر مجبور پایا۔ چنانچہ اپنی تالیف "A.Concise History of the World" میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کے کچھ حصے نقل کرنے کے بعد اس نے لکھا: "انسانی حریت، اخوت اور مساوات کے وعظ تو دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے تھے، چنانچہ مسیح ناصریؑ کے یہاں بھی وہ بکثرت موجود ہیں، لیکن اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہے کہ ان اصولوں پر بالفعل ایک معاشرہ تاریخ انسانی میں پہلی بار قائم کیا محمد (صلی اللہ علیہ

وسلم) نے" (نوٹ: ایچ جی ویلز کی یہ عبارت اس کتاب کے نئے ایڈیشنوں نے تازہ ایڈیشن سے حذف کر دی ہے، لیکن بڑی لائبریریوں میں وہ پرانے ایڈیشن دستیاب ہیں جن میں یہ الفاظ موجود ہیں!)

ساتھ ہی شدید حسرت کے ساتھ یہ عرض کئے بغیر نہیں رہا جارہا کہ معمارِ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے بھی حصولِ پاکستان کے اصل مقصد کی وضاحت کے لئے یہی الفاظ استعمال کئے تھے کہ: "ہم پاکستان اس لئے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ عہدِ حاضر میں اسلام کے اصولِ حریّت و اخوت و مساوات کا ایک عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں" اور ۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد میں مصورِ پاکستان علامہ محمد اقبال نے بھی اپنی اس پیشگوئی کے ساتھ کہ "ہندوستان کے شمال مغربی علاقوں پر مشتمل ایک آزاد مسلمان ریاست کا قیام تقدیرِ الٰہی ہے" یہی فرمایا تھا کہ "اگر ایسا ہوگیا تو ہمیں ایک موقع مل جائے گا کہ اسلام کی حقیقی تعلیمات کے چہرۂ روشن پر جو پردے عرب ملوکیت کے دور میں پڑ گئے تھے انہیں ہٹا کر اسلام کا اصل روئے انور دنیا کو دکھا سکیں!"—— لیکن افسوس صد افسوس، کہ قیام پاکستان کے لگ بھگ ۴۵ سال بعد بھی ہنوز روزِ اول والا معاملہ ہے اور اس سمت میں کوئی پیش قدمی نہیں ہو سکی—— کاش! اے کاش!! کہ ع "کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو!" کے مصداق ملتِ اسلامیہ پاکستان اب بھی اپنے اصل ہدف کی طرف بڑھنے کا عزمِ مصمّم کرلے—— آمین! وَمَاذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ!

قرآن حکیم کی مقدّس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

الہدیٰ قسط: ۸۳

درس ۱ : بعنوان صبر و مصابرت

سورۃ العصر میں بیان کردہ شرائط نجات میں سے آخری شرط

صبر و مصابرت

سورۃ آلِ عمران کی آخری آیت کی روشنی میں

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ اَمَّا بَعْدُ

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ○

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ

مطالعۂ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا سلسلے وار درس ان مجالس میں ہو رہا ہے اس کا پانچواں حصہ مباحثِ صبر و مصابرت پر مشتمل ہے۔ اس کے لئے ایک نہایت جامع اور موزوں عنوان کے طور پر سورۂ آلِ عمران کی آخری آیت کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس آیۂ مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے "اے ایمان والو' صبر کی روش اختیار کرو اور صبر کے معاملے میں اپنے مخالفین اور اپنے دشمنوں پر بازی لے جاؤ اور ہر ہر جانب سے چوکس اور چوکنے رہ کر حفاظت کرو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم فلاح پاؤ"۔

اس آیۂ مبارکہ کا اختتام 'فلاح' کے لفظ پر ہوا اور یہاں فلاح کا ذکر مومن کے اصل مقصود کی حیثیت سے آیا ہے۔ فلاح کے معنی اور مفہوم پر اس سے پہلے اس منتخب نصاب میں سورۂ مؤمنون کی پہلی آیت (قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ) کے حوالے سے مفصل گفتگو ہو چکی ہے۔ یہاں سب سے پہلے تقویٰ کی حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے۔ تقویٰ قرآن حکیم کی ایک نہایت جامع اصطلاح ہے۔ تقویٰ کا مادہ "و' ق اور ی" ہے۔ اس کا لغوی مفہوم ہے بچنا۔

سوال یہ ہے کہ کس شے سے بچنا؟ مراد ہے کہ اس دنیا میں اللہ کے احکام کی خلاف ورزی سے بچنا' آخرت میں اللہ کے غضب اور اس کی سزا سے بچنا۔ گویا تقویٰ پورے دینی عمل کے لئے یا پورے سلوکِ قرآنی کے لئے ایک مستقل روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس طرح دنیا میں ہم ع "ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں" کے مصداق بہتری کے حصول کی کوشش کرتے ہیں' دین میں بھی خوب تر کی طرف پیش قدمی کرنا ہمارا مقصودِ حیات ہونا چاہئے۔ اسی لئے فرمایا: "فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ" کہ نیکیوں میں' خیر میں' بھلائی میں' ایمان میں' عملِ صالح میں مسلسل ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہو! اس کے لئے جو قوتِ محرکہ درکار ہو سکتی ہے' قرآن اسے لفظِ تقویٰ سے تعبیر کرتا ہے۔ اس ضمن میں سورۃ المائدہ کی آیت نمبر۹۳ بہت اہم ہے جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کے علمی و عملی ارتقاء کا دار و مدار روحِ تقویٰ پر منحصر ہے۔ فرمایا:

"لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا إِذَا مَا اتَّقَوْا وَآمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَآمَنُوا ثُمَّ اتَّقَوْا وَأَحْسَنُوا ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ" ○

کہ جب کھانے پینے کی چیزوں میں حلت و حرمت کا پورا ضابطہ بیان ہو گیا تو کچھ مسلمانوں کے دلوں میں ایک تشویش سی پیدا ہوئی کہ جو چیزیں ہم پہلے استعمال کر چکے ہیں ایسا تو نہیں کہ ان ناجائز چیزوں کے اثرات ہمارے وجود میں باقی رہ جائیں اور ہمارے اعمالِ صالحہ پر وہ اثر انداز ہوں!! ان کی اس تشویش کے ازالے کے لئے فرمایا کہ اہلِ ایمان نے اس سے پہلے جو کچھ کھایا یا پیا ہے اس کی ان سے کوئی باز پرس نہیں' اس سے کوئی حرج واقع نہیں ہوتا' جبکہ انہوں نے تقویٰ کی روش اختیار کی۔ اس کو اگلے جملے میں یوں بیان فرمایا: "إِذَا مَا اتَّقَوْا وَآمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ" کہ جب انہوں نے تقویٰ کی روش اختیار کی' ایمان لائے اور نیک عمل کئے۔ "ثُمَّ اتَّقَوْا وَآمَنُوا" پھر مزید تقویٰ ان میں پیدا ہوا' اور انہیں ایمان میں مزید ترقی حاصل ہوئی ـــــ یہاں ایمان کے دو مراتب یا مدارج کی جانب اشارہ فرمایا۔ ایک ایمان کا اولین یا ابتدائی مرحلہ ہے جس میں عملِ صالح کا ذکر ایک جداگانہ ENTITY کی حیثیت سے کیا گیا ہے اور دوسرا ایمان کا اس سے برتر اور اعلیٰ مرتبہ ہے جہاں عمل اور ایمان ایک وحدت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں' لہٰذا پھر عمل کے

دوبارہ ذکر کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مزید فرمایا "ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا" پھر ان میں تقویٰ اور بڑھا اور نتیجۃً" وہ درجۂ احسان پر فائز ہوگئے اور یہ تقویٰ کی معراج ہے۔ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ "اور اللہ تعالیٰ محسنین سے محبت کرتا ہے"۔ تو سورۂ آلِ عمران کی اس آخری آیت کے آخری حصے "وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ" میں تو گویا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوگیا' اب اس کے پہلے ٹکڑے پر توجہ مرتکز کیجئے جو منتخب نصاب میں ہمارے آج کے موضوع کے اعتبار سے اہم تر ٹکڑا ہے۔

فرمایا: "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا" آیت کے اس حصے میں "صبر" ہی سے دو فعلِ امر وارد ہوئے ہیں' دو حکم ہیں کہ جو مسلمانوں کو دیئے گئے۔ ایک "اِصْبِرُوْا" صبر کرو اور دوسرے "صَابِرُوْا" یہاں یہ "باب مفاعلہ" سے صیغۂ امر ہے۔ جس طرح اس باب میں قتل سے "مقاتلہ" اور جہد سے "مجاہدہ" کے مصادر آتے ہیں اسی طرح صبر سے مصدر ہوگا "مصابرہ"۔ صبر ایک یک طرفہ عمل ہے۔ صبر کے معنی ہیں اپنے آپ کو روک کر رکھنا' تھام کر رکھنا اور اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ اپنی منزل اور اپنے ہدف کے تعین کے بعد انسان پوری ثابت قدمی سے اس کی طرف پیش قدمی جاری رکھے۔ کوئی مخالفت' کوئی رکاوٹ' کوئی تشدد' اسے اپنے مقصد اور اپنی منزلِ مقصود کی جانب پیش قدمی سے روک نہ سکے۔ اور دوسرا پہلو یہ کہ کوئی طمع' کوئی لالچ' یا کسی اعتبار سے مرغوباتِ نفس کی کوئی کشش بھی اس کی راہ میں حائل نہ ہونے پائے۔ یہ دونوں پہلو "صبر" میں مضمر ہیں۔

محض صبر نہیں' مصابرت درکار ہے

جیسا کہ اس سے پہلے بارہا عرض کیا جاچکا ہے' ایک بندۂ مومن جس ماحول میں ایمان اور عمل کی منزلیں طے کرتا ہے وہاں کوئی خلا نہیں ہوتا۔ اگر اس کا ایک مخصوص نظریہ ہے تو اسی معاشرے میں اور بھی نظریات کارفرما ہیں' جہاں اس کا ایک مسلک ہے وہاں دوسرے مسالک کے لوگ بھی موجود ہیں۔ یہ دنیا مختلف نظریات کی ایک آماجگاہ ہے یہاں تو کشمکش (STRUGGLE) ہو کر رہے گی۔ چنانچہ "صبر" کے بعد دوسرا لفظ یہاں آیا "وَصَابِرُوْا"۔ مصابرہ کا لفظ مجاہدہ اور مقابلہ' کے وزن پر آتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ اہل کفر

اپنے نظریات کے دفاع میں صبر کریں گے' اہلِ شرک اپنے معبودانِ باطل کے لئے ایثار کا وطیرہ اپنائیں گے' اے اہلِ ایمان! تمہیں اللہ کے لئے' اس کے دین کی سربلندی کے لئے صبر کرنا ہے اور صبر میں ان سب معاندین پر بازی لے جانا ہے۔ جب تک تم انہیں اس مقابلۂ صبر میں نیچا نہ دکھاؤ گے' آگے نہ بڑھ سکو گے۔ ہونا یہ چاہئے کہ اس تصادم' کشمکش اور ٹکراؤ میں تمہارا صبر دوسروں کے صبر پر سبقت لے جائے' تمہارا ایثار و قربانی دوسروں سے بڑھ جائے' تم اپنے مقصد کے حصول کے لئے جان و مال نچھاور کرنے میں دوسروں پر بازی لے جاؤ۔ اگر تم نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا تو کامیابی تمہارے قدم چومے گی اور لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ کا معاملہ صرف اسی ایک صورت میں ممکن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آیۂ مبارکہ ہمارے منتخب نصاب کے اس پانچویں حصے کے لئے نہایت موزوں اور بہت جامع عنوان کی حامل ہے۔ اب آیئے ذرا ایک نگاہِ بازگشت ڈالیں کہ صبر کا ذکر اس سے پہلے ہمارے اس منتخب نصاب میں کہاں کہاں ہوا ہے۔

گذشتہ اسباق میں "صبر" کا ذکر

ذہن میں تازہ کر لیجئے کہ منتخب نصاب کا پہلا حصہ چار جامع اسباق پر مشتمل تھا اور ان چاروں اسباق میں چوٹی کی چیز اور آخری منزل صبر ہی کی تھی۔ سورۃ العصر کی طرف آیئے' سورۃ کا اختتام "صبر" ہی کے لفظ پر ہوا: وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ آیۂ برّ کو دیکھئے' نیکی اور تقویٰ کا نقطۂ عروج' (CLIMAX) وہاں کن الفاظ میں بیان ہوا' وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ" اگلے سبق یعنی سورۂ لقمٰن کے دوسرے رکوع پر نگاہ ڈالئے' آیت نمبر ۱۷ میں صبر کا ذکر موجود ہے۔ یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ" سورہ حم السجدہ کی آیات تیس تا چھتیس پر توجہ کو مرکوز کیجئے' وہاں بھی صبر کا ذکر بڑے اہتمام سے ہوا: وَمَا یُلَقّٰىہَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا یُلَقّٰىہَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ۝ ان چاروں جامع اسباق میں جس بلند ترین اور آخری منزل کی نشان دہی کی گئی وہ صبر ہی ہے۔ ان چاروں مقامات میں صبر کا وہ پہلو زیادہ پیشِ نظر ہے جس سے انسان اس وقت دوچار ہوتا ہے جب وہ تواصی بالحق' دعوت الی اللہ' اور "امر بالمعروف

اور نہی عن المنکر" کا فریضہ سرانجام دے رہا ہو۔ ظاہر بات ہے کہ حق کی بات کہنی ہے تو طبیعت میں سہار اور تحمل کا ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کہ یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ "اَلْحَقُّ مُرٌّ" سچ کڑوا ہوتا ہے۔ سچائی عام طور پر قابل قبول نہیں ہوتی۔ لہٰذا تکالیف آئیں گی' ان کو جھیلنے کے لئے صبر کا بھرپور مادہ ہونا چاہئے۔ پہلے سے تیار ہوجاؤ کہ یہ راستہ پرخار ہے' اس میں مخالفتوں کے کانٹے بچھے ہوئے ہیں' یہ پھولوں کی سیج نہیں ہے! اس کے بارے میں سورۃ لقمان کے دوسرے رکوع میں ہم یہ پڑھ آئے ہیں: "اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ" کہ یہ کام بڑی ہمت کے متقاضی ہیں۔

اس کے بعد عملِ صالح کی تفاصیل پر مشتمل جو حصۂ سوم ہمارے اس منتخب نصاب میں آیا وہاں سورۃ الفرقان میں لفظ صبر ایک دوسری شان کے ساتھ وارد ہوا تھا۔ فرمایا: "اُولٰئِکَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَۃَ بِمَا صَبَرُوْا" کہ یہ ہیں وہ لوگ جن کو جنت کے بالا خانے عطا کئے جائیں گے اس صبر کے عوض جو انہوں نے کیا ـــــ یہاں لفظ صبر درحقیقت انسانی شخصیت' اس کی سیرت و کردار کے ایک نہایت ہمہ گیر پہلو کی طرف اشارہ کررہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان پر کاربند رہنا بھی ممکن نہیں جب تک کہ صبر نہ ہو' عملِ صالح کے بنیادی تقاضے بھی پورے نہیں ہوسکتے جب تک انسان میں صبر کا مادہ نہ ہو۔ اپنے جذبات کو تھامنا بھی صبر ہی سے ممکن ہوتا ہے اور خواہشات کی لگامیں بھی صبر ہی کے ذریعے کھینچی جاسکتی ہیں۔ سورۃ النّٰزعات کی آیت: "وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی" میں صبر ہی کا تو بیان ہے کہ خواہشات کو دبانا' شہوات کو لگام دینا اور مرغوباتِ نفس کے حصول کے لئے طبیعت میں جو طوفان بپا ہے اس کو روک کر رکھنا ہوگا' تبھی ایمان پر گامزن رہنا اور عملِ صالح کے ابتدائی تقاضے پورے کرنا ممکن ہوگا تبھی اس راہ میں آگے قدم بڑھانے کا امکان ہوگا' پھر جب احقاقِ حق اور ابطالِ باطل' یا بالفاظِ دیگر اعلاءِ کلمۃ اللہ اور غلبۂ دین کی جدوجہد کا مرحلہ آتا ہے تو ظاہر بات ہے یہاں نمایاں ترین وصف صبر اور مصابرت کا ہی ہے۔ اسی مفہوم کی تائید سورہ مومنون میں اس طرح سے ہوتی ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان کافروں سے جو دنیا میں حق کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے رہے' یہ فرمائیں گے: "اِنِّیْ جَزَیْتُھُمُ الْیَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا" کہ یہ لوگ جن کا تم دنیا میں استہزا اور تمسخر کرتے رہے' جن کی عملی جدوجہد میں تم رکاوٹ بنتے رہے' جنہیں کمزور دیکھ کر

تم نے دبائے رکھا اور وہ کمالِ ہمت و بردباری سے صبر کا دامن تھامے رہے' دیکھو آج اس صبر کی بدولت میں انہیں کیسا عمدہ بدلہ دے رہا ہوں' کیا اعلیٰ مقامات انہیں حاصل ہو رہے ہیں !! حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید میں صبر کا ذکر اس طور سے کیا گیا ہے کہ سلوکِ قرآنی میں صبر بنیادی اور لازمی جزو کی حیثیت رکھتا ہے اور صراطِ مستقیم کا ہر ہر مرحلہ صبر ہی کے ذریعے طے پاتا ہے۔ اس پورے عمل کی روحِ رواں' اس کے جذبۂ محرکہ' اور اس کی شرط ناگزیر کے طور پر صبر ہی کا ذکر ہوتا ہے۔ اب آیئے اس پہلو سے جائزہ لیں کہ ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے قرآن مجید میں صبر کا ذکر کس طور سے آیا ہے!---

نبی اکرمؐ کو صبر کی تاکید و تلقین

قرآن حکیم کی ابتداءً نازل ہونے والی سورتوں میں ہر جگہ صبر کا لفظ فعلِ امر بصیغہ واحد وارد ہوا ہے۔ اور اس کے مخاطب اولین خود حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ پر جب وحی کا نزول شروع ہوا' تو فریضۂ رسالت کی ادائیگی کے پہلے حکم کے ساتھ ہی صبر کی ہدایت بھی نازل ہوئی۔ فرمایا گیا

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَاَنْذِرْ ○ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ○ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ○ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ○ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ○ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ○

دیکھئے آخری آیت میں صبر کا حکم موجود ہے۔ جس راہ پر آپ نے قدم رکھا ہے یہ اس کا لازمی تقاضا ہے۔ اب جھیلنا ہوگا' برداشت کرنا ہوگا' تحمل کا مظاہرہ کرنا ہوگا' مصائب' تکالیف اور آزمائشوں کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہوگا۔ چنانچہ ابتدائی ہر وحی میں نمایاں طور پر لفظ صبر کہیں حکم کے انداز میں اور کہیں تلقین و ہدایت کے پیرائے میں آتا ہے۔ سورۂ قلم کا اختتام ان الفاظِ مبارکہ پر ہوتا ہے **:فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ** "کہ اے نبی اپنے رب کے حکم کا انتظار کیجئے اور اس کے لئے صبر کی روش پر کاربند رہئے' خود کو تھامے رکھئے' روکے رکھئے اور اس مچھلی والے یعنی حضرت یونس علیہ السلام کے مانند نہ ہو جایئے جنہوں نے کچھ جلدی کی تھی۔ کہیں فرمایا جاتا ہے **"فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا"** کہ اپنے رب کے لئے صبر کیجئے' اس کے حکم کا

انتظار کیجئے اور ان گناہوں میں ڈوبے ہوئے منکر لوگوں کی باتوں میں نہ آجائیے۔ کہیں صبر کی تلقین ان الفاظ میں کی جاتی ہے :**فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا**" پس صبر کیجئے خوبصورتی کے ساتھ! ---- ایک مجبوری کا صبر ہوتا ہے۔ مثلاً کسی نے آپ کو گالی دی اور آپ نے جواباً گالی دے دی اور دعویٰ یہ ہے کہ میں صبر کررہا ہوں! یہ صبرِ جمیل نہیں ہے۔ جھیلئے' برداشت کیجئے اور خوبصورتی کے ساتھ صبر کیجئے۔ کہیں حکم ہوتا ہے "**فَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ**" صبر کیجئے اور صبر کے لئے آپ کا سہارا اللہ کی ذات ہے۔ اللہ سے قلبی تعلق اور اللہ پر توکل و اعتماد' یہی آپ کے لئے صبر کی اصل بنیادیں ہیں۔ ایک جگہ فرمایا :"**فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ**" صبر کیجئے جیسے کہ ہمارے صاحبِ عزیمت رسول صبر کرتے رہے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کا سورۃ العنکبوت میں ذکر ہے کہ ساڑھے نوسو برس تک دعوت دیتے رہے۔ مخالفت ہوئی' انکار و اعراض اور مسلسل تمسخر و استہزاء ہوا لیکن وہ اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی میں لگے رہے' ان کے پائے ثبات میں کہیں لغزش نہ آئی۔ یہ ہے قرآن مجید کی ابتدائی سورتوں میں صبر کا حکم' جو بتکرار و اعادہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وارد ہوا۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوت کا آغاز فرمایا تو سب سے پہلا ردِّ عمل جو اس معاشرے کی جانب سے ظاہر ہوا وہ تمسخر و استہزا کی صورت میں تھا۔ جس میں کہیں کہیں ظاہری ہمدردی کا عنصر بھی شامل ہوتا تھا' کہ نہ معلوم بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا' اچھے بھلے آدمی تھے' ہمیں تو ان سے بڑی اچھی توقعات تھیں' بڑی اچھی امیدیں ان سے وابستہ تھیں' نہ معلوم کیا ہوا ہے۔ اسی طرح "**نَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ ذَالِكَ**" اور "نقلِ کفر کفر نہ باشد" کوئی کہتا کہ خلل دماغی کا کوئی عارضہ لاحق ہو گیا ہے' کوئی جنون کا عارضہ ہو گیا ہے یا کسی آسیب کا سایہ ہو گیا ہے۔ یہ باتیں استہزاءً بھی کہی گئیں اور تمسخر کے انداز میں بھی' ہمدردانہ بھی کہیں گئیں اور تاسف کے ساتھ بھی' ان سب باتوں کے جواب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کرنے' جھیلنے اور برداشت کرنے کا حکم دیا گیا۔ انتیسویں پارے کی دوسری سورۃ سورہ ن' جسے سورۃ القلم بھی کہتے ہیں' کی ابتدائی آیات کے پس منظر میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معاندین کے اس طرزِ عمل پر بہت ملول اور غمگین ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ○ مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ○ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ○ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ○ فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ○ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ○

"گواہ ہے قلم اور جو کچھ کہ یہ لکھتے ہیں۔ اے نبی آپ اپنے رب کی رحمت اور نعمت سے مجنون نہیں ہیں (آپ ملول و غمگین اور رنجیدہ نہ ہوں' آپ ان پاگلوں کے کہنے سے کہیں پاگل تھوڑا ہی ہوجائیں گے) اور یقیناً آپ کے لئے وہ اجر ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا اور آپ تو اخلاق کی بلندیوں پر فائز ہیں۔ (کیا دنیا نے ایسا پاگل اور ایسا مجنون کبھی دیکھا ہے جو خلقِ عظیم کا پیکر ہو' کردار اور شرافت میں کوئی اس کا ہمسر نہ ہو)۔ یہ کوئی دن کی بات ہے کہ آپ بھی دیکھ لیں گے اور یہ لوگ بھی دیکھ لیں گے' ساری دنیا دیکھ لے گی کہ کس کا دماغ الٹ گیا تھا (کس کو دماغ کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا) جلد ہی حقیقت سامنے آجائے گی۔"

سورۂ نون کا اختتام اس آیت پر ہورہا ہے جس کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے کہ: "فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ" کہ اے نبی جھیلئے' برداشت کیجئے' اپنے رب کے حکم کا انتظار کیجئے کہ وہ کب فیصلہ سناتا ہے اور حضرت یونس علیہ السلام کی طرح کوئی عاجلانہ اقدام نہ کیجئے۔

ابتداء میں تو یہ تمسخر واستہزا کسی درجے میں کچھ ہمدردانہ انداز کا تھا لیکن جیسے جیسے بات آگے بڑھی تمسخر و استہزا کا معاملہ سختی اور شدت کا روپ دھارتا چلا گیا۔ چنانچہ اس کی جھلک سورۂ مزمل کی اس آیت کے پس پردہ نظر آتی ہے "وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا"○ کہ اے نبی' صبر کیجئے ان کڑوی باتوں پر جو یہ کہہ رہے ہیں اور ان سے قطع تعلق کر لیجئے' لیکن یہ قطع تعلق' ہجرِ جمیل ہو۔ اگلی آیت میں بھی یہی مضمون بیان ہوا: وَذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيْلًا○ چھوڑ دیجئے مجھے اور ان جھٹلانے والوں کو جو بڑے دولتمند ہیں' سرمایہ دار ہیں' صاحبِ اقتدار اور صاحبِ وجاہت لوگ ہیں' ہم ان سے نپٹ لیں گے۔ آپ اپنی توجہ کو اپنی دعوت و تبلیغ پر مرتکز رکھئے۔ آپ ان کی جانب التفات نہ فرمائیے' ان سے نپٹنے کے لئے ہم کافی ہیں۔ اِنَّ لَدَيْنَا

نَكَالًا وَّ جَحِيْمًا ۝ وَّطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَّعَذَابًا اَلِيْمًا ۝ ہمارے پاس ان کے لئے عذاب کا پورا سامان مہیا ہے جو منہ کھولے ان کا منتظر ہے۔ یہ کہیں بچ نہ نکلیں گے۔ لیکن آپ ان سے چشم پوشی فرمایئے۔ ایک اور مقام پر بڑے خوبصورت انداز میں یہ بات بیان فرمائی: فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ" کہ آپ ان منکروں سے اپنی توجہ کو ہٹا لیجئے' ان مخالفین کی جانب ملتفت ہی نہ ہوں' ان کے استہزاء کی طرف توجہ ہی نہ کیجئے' آپ لگے رہئے دعوت و تبلیغ اور فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں' انذار اور تبشیر میں۔ "فَذَكِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ" (سورۃ الغاشیہ) آپ یاد دہانی کراتے رہئے' آپ کا کام یاددہانی کرانا ہے' آپ ان پر نگران اور ان کے ذمے دار نہیں ہیں' آپ سے یہ باز پرس نہیں ہوگی کہ انہوں نے کیوں آپ کی دعوت پر لبیک نہ کہا! ــــــ سورۃ الاعلیٰ میں یہی بات ایک اور انداز سے آئی: فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝ کہ آپ تذکیر کرتے رہیئے اگر وہ تذکیر مفید ہو' اس کے مفید نتائج ظاہر ہوں۔ جس کے دل میں کچھ بھی اللہ کا خوف ہے' کسی بھی درجے میں اسے اپنے خالق اور مالک اور اس کے حضور میں لوٹنے کا خیال ہے تو وہ اس سے نصیحت اخذ کرلے گا اور اس تذکیر سے فائدہ اٹھائے گا۔

صحابہ کرامؓ کے لئے صبر کے مرحلے کا آغاز

بہرحال صبر کے ضمن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے تمسخر و استہزاء اور مذاق کے مقابلے میں جمے رہنے' ڈٹے رہنے' جھیلنے' برداشت کرنے' اور ثابت قدم رہنے کا حکم ہوا۔ تاریخی اعتبار سے یہ بات جان لینی چاہئے کہ تقریباً تین برس تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اندر ہی اندر باہمی گفتگوؤں اور انفرادی رابطوں (personal contacts) تک محدود رہی۔ ابھی لوگوں کو خطرے کا زیادہ احساس نہیں ہوا۔ نبوت کے چوتھے برس لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ دعوت تو ایک بہت بڑے چیلنج کی شکل اختیار کرگئی ہے۔ ع نظامِ کہنہ کے پاسبانو' یہ معرضِ انقلاب میں ہے" تب ان کے کان کھڑے ہوئے اور سوچنے لگے کہ آپؐ کا راستہ روکنا ہوگا' جسے ہم مشتِ غبار سمجھے تھے یہ تو ایک تیز و تند آندھی بن کر ہمارے اس پورے نظام' ہمارے مفادات اور اس پورے معاشرتی ڈھانچے اور VESTED INTEREST کو خس

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

حسنِ انتخاب

تبلیغ کس لیے؟

مولانا امین احسن اصلاحی کی معرکۃ الآرا تصنیف
"دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار" کا ایک اہم باب

جس سے بجا طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خلافت کے ادارے کے قیام کے لئے تن من دھن سے جدوجہد کرنا ہر مسلمان کا اہم ترین دینی فریضہ ہے!

انبیاء کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر نیکی اور بدی کے پہچاننے کی قابلیت اور نیکی کے اختیار کرنے اور بدی سے بچنے کی خواہش ودیعت کردی ہے۔ اس پہلو سے انسان ایک اعلیٰ خلقت اور ایک بلند فطرت لے کر دنیا میں آیا ہے اور اس بات کا اہل ہے کہ اپنی سمجھ سے نیکی کو پسند اور بدی کو ناپسند کر کے اللہ تعالیٰ کے یہاں انعام کا مستحق ہو اور اگر اپنی فطرت کے خلاف خیر کی جگہ شر کا راستہ اختیار کرے تو فاطر کی طرف سے اپنی اس خلافِ فطرت روش پر سزا پائے۔ لیکن اگر ایک طرف اس کی فطرت میں یہ پہلو خوبی اور کمال کا ہے تو دوسری طرف بعض اعتبارات میں خلا اور نقص بھی ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نہ دنیا میں انسان کی ہدایت و ضلالت کے معاملہ کو تنہا اس کی فطرت پر چھوڑا نہ آخرت میں اس کو جزاء و سزا دینے کے لئے اس فطری رہنمائی کو کافی قرار دیا۔ بلکہ فطرت کے مقتضیات اور اس کی مخفی قابلیتوں کو آشکارا کرنے اور خلق پر اپنی حجت تمام کرنے کے لئے اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو بھیجا تاکہ قیامت کے دن لوگ یہ عذر نہ کرسکیں کہ ان کو نیکی اور سچائی کا راستہ معلوم نہیں تھا' اس وجہ سے وہ گمراہی کی وادیوں میں بھٹکتے رہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید کی ان آیتوں میں واضح کیا گیا ہے:

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ○ (النساء - ۴: ۱۶۵)

"اللہ نے رسولوں کو خوشخبری دینے والے اور ہوشیار کرنے والے بنا کر بھیجا تاکہ ان رسولوں کے بعد لوگوں کے لئے اللہ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ اللہ غالب اور حکیم ہے۔"

يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْ بَشِيْرٍ وَّ لَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّ نَذِيْرٌ ۗ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ (المائدہ - ۵: ۱۹)

"اے اہلِ کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول' رسولوں کے ایک وقفے کے بعد' تمہارے لئے دین کو واضح کرتا ہوا آگیا ہے۔ مبادا تم کہو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا ہوشیار کرنے والا تو آیا ہی نہیں۔ دیکھ لو' ایک بشیر و نذیر تمہارے پاس آگیا ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

انبیاء کے باب میں قانونِ الٰہی

اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں اپنے ہادی اور رسول بھیجے اور محض اس لئے کہ لوگوں پر حق پوری طرح آشکارا ہو جائے' کج روی اور گمراہی پر باقی رہنے کے لئے لوگوں کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے' انبیاء کے بارے میں قانونِ الٰہی یہ رہا ہے کہ وہ سب کے سب بلا استثناء انسانوں میں سے آئے' فرشتوں یا جنوں میں سے نہیں آئے' تاکہ انسانوں پر انسانی فطرت کے تقاضے انسانوں ہی کے ذریعہ سے واضح کئے جائیں اور لوگوں کے لئے یہ کہنے کا موقع باقی نہ رہے کہ انسان کے لئے کسی غیر انسان کا علم و عمل کیسے نمونہ کا کام دے سکتا ہے۔ اسی طرح بعض مستثنیٰ مثالوں کے سوا' ہر قوم کے اندر اللہ تعالیٰ نے اسی قوم کے اندر سے رسول بھیجے تاکہ قومی اجنبیت لوگوں کے لئے قبولِ حق میں مانع نہ ہو۔ علیٰ ہذا القیاس ہر قوم کے لوگوں پر اللہ کے رسولوں نے انہی کی زبان میں حق کی تبلیغ کی تاکہ لوگوں پر حق اچھی طرح واضح ہو سکے اور زبان بھی صاف ستھری' اپج سے بالکل پاک اور سب کے فہم سے قریب تر اور دل نشین استعمال کی۔ پھر اللہ کے

ان رسولوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ لوگوں کو ایک مرتبہ حق کی طرف پکار دیا ہو بلکہ اپنی پوری پوری زندگیاں اسی مقصد میں لگا دیں اور جن باتوں کی دوسروں کو دعوت دی ان کو خود بھی کر کے دکھا دیا اور ان کے ساتھیوں نے بھی اپنی عملی زندگی میں ان کا مظاہرہ کیا۔ یہ سارا اہتمام محض اس غرض کے لئے کیا گیا کہ خلق کو خالق کی رضا حاصل کرنے اور دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لئے جو کچھ جاننا چاہئے اس کے بتانے میں کسی پہلو سے کوئی کسر نہ رہ جائے اور لوگ قیامت کے دن اپنی شرارتوں اور بد عملیوں کا الزام اللہ سبحانہ و تعالیٰ پہ نہ ڈال سکیں۔

خاتم الانبیاء کی بعثت

جب تک دنیا نے تمدنی و اجتماعی زندگی کے وہ وسائل نہیں پیدا کر لئے جو ساری دنیا کو ایک داعئ حق کی دعوت پر جمع کرنے کے لئے ضروری تھے اس وقت تک اللہ تعالیٰ نے الگ الگ قوموں کے اندر رسولوں کا بھیجنا جاری رکھا۔ لیکن جب انبیاء کی تعلیم و تربیت سے قوموں کا اخلاقی و اجتماعی شعور اتنا بیدار ہو گیا کہ وہ ایک عالمگیر نظامِ عدل کے تحت زندگی بسر کر سکیں اور ساتھ ہی دنیا کے مادی وسائلِ اجتماع و تمدن نے بھی اس حد تک ترقی کر لی کہ ایک ہادی کا پیغامِ ہدایت دنیا کے ہر گوشے میں بسہولت پہنچ سکے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اس بات کی مقتضی ہوئی کہ وہ خاتم الانبیاء محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجے اور ان کے ذریعے سے لوگوں کو وہ مکمل نظامِ زندگی عنایت فرمائے جو تمام بنی نوع انسان کے مزاج اور ان کے حالات و ضروریات کے بالکل مطابق ہو۔ یہی خدائی نظامِ زندگی ہے جس کو ہم اسلام کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ اپنی روح کے اعتبار سے وہی دین ہے جس کو تمام انبیاء لے کر آئے۔ صرف بعض اعتبارات سے یہ ان سے مختلف ہے۔ پہلے انبیاء نے عقائد کی تعلیم اپنی قوموں کی استعداد کے لحاظ سے دی تھی، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے عقائد کی تعلیم اس معیارِ فہم کے لحاظ سے دی جو اللہ تعالیٰ نے بنی نوعِ انسان کو عطا فرمایا ہے۔ دوسرے انبیاء نے جن قوانین کی تعلیم دی ان میں ان کی قوموں کے خاص مزاج اور ان کے خاص خاص امراض کی بھی رعایت تھی، لیکن اسلام کے قوانین میں کسی خاص قومی اور جماعتی مزاج و رجحان کے لحاظ کی بجائے صرف مزاجِ

انسانی کا لحاظ ہے۔ دوسرے انبیاء کو جو نظامِ زندگی خدا کی طرف سے عطا ہوا وہ صرف ان قوموں کی ضروریات کے اعتبار سے تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے جو نظامِ زندگی دنیا کو ملا وہ صرف کسی خاص قوم ہی کی ضروریات کو پورا نہیں کرتا بلکہ بنی نوعِ انسان کی تمام انفرادی و اجتماعی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے دو پہلو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر چونکہ تمام عالم کی ہدایت و رہنمائی اور تمام مخلوق پر اتمامِ حجت کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی اور آپؐ کے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہیں تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ ایک بعثتِ خاص' دوسری بعثتِ عام ـــــ آپؐ کی بعثتِ خاص اہلِ عرب کی طرف تھی اور اہلِ عرب کے ساتھ اسی خاص نسبت کی وجہ سے آپؐ کو نبی امی یا نبی عربی کہا گیا اور آپؐ پر جو وحی نازل ہوئی اس کی زبان بھی عربی ہوئی۔ اس بعثت کی ذمہ داریاں ـــــ یعنی تبلیغ اور اتمامِ حجت ـــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے براہِ راست انجام دیں۔

آپؐ کی بعثتِ عام تمام دنیا کی طرف ہے۔ اس بعثت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ایک امت عطا فرمائی اور امت کو یہ حکم دیا کہ رسولؐ نے جس دین کی تبلیغ تم پر کی ہے اس کی تبلیغ اسی طرح تم دوسروں پر کرتے رہنا:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ- ۲: ۱۴۳)

"اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے۔"

وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ (الانعام- ۶: ۱۹)

"اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے کہ میں بھی اس کے ذریعہ سے تم کو ڈراؤں اور وہ بھی جن کو یہ پہنچے۔"

دین کی حفاظت کے لئے دو خاص انتظام

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ عام کے مقصد کی تکمیل کے لئے ایک پوری

امت کو اللہ تعالیٰ نے اس لئے برپا کیا تاکہ ہر ملک' ہر قوم اور ہر بولی میں یہ دعوتِ حق قیامت تک بلند ہوتی رہے اور دنیا الگ الگ نبیوں کی بعثت اور الگ الگ زبانوں میں وحی کے اترنے کی ضرورت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بے نیاز ہو جائے۔ چونکہ آپؐ کے بعد اب کسی اور نبی کی بعثت ہونے والی نہیں تھی' خلق کی رہنمائی اور اتمامِ حجت کی پوری ذمہ داری ہمیشہ کے لئے آپؐ کی امت پر ڈال دی گئی تھی' اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے دین کو صحیح حالت میں محفوظ رکھنے کے لئے دو خاص انتظام فرمائے۔ ایک یہ کہ قرآن مجید کو ہر قسم کی کمی بیشی اور تحریف و تبدیلی سے محفوظ فرمادیا تاکہ دنیا کو اللہ کی ہدایت معلوم کرنے کے لئے کسی نئے نبی کی ضرورت باقی نہ رہے۔ دوسرا یہ کہ اس امت کے اندر' جیسا کہ صحیح حدیثوں میں وارد ہے' ہمیشہ کے لئے ایک گروہ کو حق پر قائم کردیا تاکہ جو لوگ حق کے طالب ہوں ان کے لئے ان کا علم و عمل شمعِ راہ کا کام دیتا رہے۔

اس طرح کی ایک جماعت ——— اگرچہ اس کی تعداد کتنی ہی تھوڑی ہو ——— اس امت میں ہمیشہ باقی رہے گی۔ فتنوں کا کتنا ہی زور ہو' لیکن یہ صالح جماعت[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کے عمل کو زندہ رکھے گی۔ جب ضلالت کا اثر اس امت کے رگ و ریشہ میں اس طرح سرایت کرجائے گا جس طرح دیوانے کتے کے کاٹے ہوئے آدمی کے رگ و ریشہ میں اس کا زہر سرایت کر جاتا ہے اس وقت بھی اللہ تعالیٰ اس امت کے ایک عضو کو اس زہر سے محفوظ رکھے گا۔ جب دنیا کا خمیر اتنا بگڑ جائے گا کہ معروف منکر بن جائے گا اور منکر معروف بن جائے گا اور اہلِ بدعت کا اتنا زور ہو گا کہ معروف کے ان داعیوں کی حیثیت دنیا میں اجنبیوں اور بیگانوں کی ہو جائے گی اس وقت بھی یہ لوگ خلق کو معروف کی طرف پکارتے رہیں گے اور ہر قسم کی مخالفتوں کے باوجود

---

[1] یہاں ہمارا اشارہ "لَاتزالُ طائفۃٌ من اُمتِی قائمۃً بِامرِ اللہِ لا یَضُرُّھُمْ مَنْ خَذَلَھُمْ او خَالَفَھُمْ' حتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللّٰہِ وَھُمْ ظَاھِرُونَ علَی النَّاسِ" (صحیح مسلم : کتاب الامارۃ' باب ۵۳) (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ اللہ کے حکم پر قائم رہے گا' جو کوئی ان کو نقصان پہنچانا چاہے یا بگاڑنا چاہے تو وہ ایسا نہ کر پائے گا' یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آن پہنچے' اور وہ لوگوں پر غالب رہیں گے) اور اس مفہوم کی ان متعدد روایات کی طرف ہے جو صحاح میں وارد ہیں اور جن کی صحت پر ائمہ حدیث کا اتفاق ہے۔

لوگوں کی پیدا کی ہوئی خرابیوں کی اصلاح کی کوشش کریں گے۔ ہر دور میں اس طرح کی جماعت کو باقی رکھنے سے اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ جس طرح علم وحی کو قرآن کی صورت میں قیامت تک محفوظ کردیا گیا ہے اسی طرح اللہ کے رسولؐ اور رسولؐ کے صحابہؓ کے علم و عمل کو اس جماعت کے ذریعہ سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کردیا جائے اور خلق کی ہدایت اور رسول کی حجت تمام کرنے کے لئے جو روشنی مطلوب ہے وہ کبھی گل ہونے نہ پائے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے الفاظ میں یہ لوگ پہاڑی کے چراغ ہوں گے جن سے راہ ڈھونڈنے والے رہنمائی حاصل کریں گے اور زمین کے نمک ہوں گے جن سے کوئی چیز نمکین کی جاسکے گی۔

تبلیغ بحیثیت ایک فریضۂ رسالت کے

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ شہادت علی الناس یا تبلیغ دین محض بطور ایک نیکی اور دینداری کے کام کے مطلوب نہیں ہے اور نہ محض مسلمانوں کی تعداد بڑھانے کے لئے مطلوب ہے' بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ عام کا جو مقصد اس امت کے ہاتھوں پورا ہونا ہے' یہ اس کا مطالبہ ہے جو اللہ کے ہر اس بندے کو ادا کرنا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں داخل ہے۔ یہ ایک فریضۂ رسالت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس امت پر ڈالا ہے۔ اگر مسلمان اس فرض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی کریں گے تو وہ اس فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی کریں گے جس کا بار اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر ڈالا ہے اور اس کوتاہی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو خیرِ امت کے اس منصب سے محروم کردے جس پر اس فرض کی ادائیگی ہی کے لئے ان کو سرفراز فرمایا ہے اور ساری دنیا کی گمراہی کا وبال ان کے سر آئے' کیونکہ آج خلق پر اتمامِ حجت کا ذریعہ یہی ہیں۔ اگر یہ اتمامِ حجت کے فرض کو ادا نہ کریں تو دنیا قیامت کے دن اللہ کے سامنے اپنی گمراہیوں کے لئے یہ عذر کرسکتی ہے کہ تو نے جن کو شہداء علی الناس بنایا تھا اور جن پر ہماری رہنمائی کی ذمہ داری ڈالی تھی انہوں نے ہمارے سامنے تیرے دین کی تبلیغ نہیں کی' ورنہ ہم ان ضلالتوں میں نہ پڑتے اور مسلمان اس الزام کا کوئی جواب نہ دے سکیں گے۔

تبلیغ کے شرائط

شہادت علی الناس یا تبلیغ عام کی یہ ذمہ داری صرف اتنے سے ادا نہیں ہوسکتی کہ دنیا میں مسلمان نامی ایک گروہ موجود ہے خواہ وہ شہادت علی الناس کا یہ فرض انجام دے یا نہ دے' اور نہ ان الٹی سیدھی تدبیروں ہی سے ادا ہوسکتی ہے جن پر کتاب کے شروع میں ہم تنقید کرکے بتاچکے ہیں کہ ان تدبیروں سے نہ صرف یہ کہ دعوتِ حق کے مقصد کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا' بلکہ الٹا ان سے شدید نقصان پہنچا۔ یہ ایک نہایت اہم فریضۂ رسالت کی ادائیگی ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کو ان شرائط کے ساتھ انجام دیا جائے جن شرائط کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کو انجام دینے کا حکم دیا ہے اور جن شرائط کے ساتھ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام نے اس کو انجام دیا ہے۔ یہاں ہم ان بعض شرطوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جو اس فرض کی ادائیگی کے لئے ناگزیر ہیں۔

پہلی شرط:

اس شہادت کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم جس دینِ حق کے شاہد ہیں پہلے صدقِ دل کے ساتھ اس پر خود ایمان لائیں۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام جس حق کی دعوت دیتے تھے پہلے اس پر خود ایمان لاتے تھے' اپنے آپ کو اس حق سے بالاتر نہیں سمجھتے تھے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ۔ (البقرہ-۲: ۲۸۵)

"رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اس پر اس کے رب کی جانب سے اتاری گئی اور مؤمنین ایمان لائے۔"

اس حق پر ایمان لانے کے بعد جو چیزیں اس کے خلاف ہوئیں خواہ وہ آباء و اجداد کا دین ہو' خواہ قوم و قبیلہ کی عصبیت ہو' خواہ اپنا شخصی اور جماعتی مفاد ہو' سب سے دست بردار ہونے کے لئے انہوں نے سب سے پہلے اپنے آپ کو پیش کیا اور ان سارے خطرات میں' جو اس ایمان کے سبب سے پیش آئے اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ (الاعراف-۷: ۱۴۳) (میں پہلا مؤمن ہوں) اور اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (الانعام-۶: ۱۶۳) (میں پہلا مسلم ہوں) کہتے ہوئے اس نے خود چھلانگ لگائی۔ یہ نہیں ہوا کہ خود تو اس سے کنارے پر کھڑے رہے' لیکن دوسروں کو للکارا کہ تمہاری نجات اگر ہے تو بس اس میں چھلانگ

لگادینے میں ہے۔

دوسری شرط:

دوسری شرط یہ ہے کہ آدمی جس حق پر ایمان لایا ہے اس کی زبان سے شہادت دے۔ جو شخص ایک حق پر ایمان لایا ہے اگر اس کو ظاہر کرسکنے کے باوجود ظاہر نہیں کرتا تو وہ گونگا شیطان ہے' اور قیامت کے دن اس پر حق کو چھپانے کا وہی جرم عائد ہوگا جو یہود پر عائد ہوا:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّہٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَکْتُمُوْنَہٗ۔

(آلِ عمران-۳:۱۸۷)

"اور یاد کرو جب کہ اللہ نے ان لوگوں سے عہد لیا جن کو کتاب دی گئی کہ تم لوگوں کے سامنے اس کتاب کو اچھی طرح ظاہر کرنا' اسے چھپانا مت۔"

اس معاملہ میں مصلحت بینی جو کچھ بھی ہونی چاہئے وہ دراصل حق کی خاطر ہونی چاہئے کہ اس کا اظہار صحیح طریق پر' صحیح محل میں' صحیح مخاطب کے سامنے ہو' تاکہ دعوتِ حق کا تخم بار آور ہو۔ اگر آدمی حق کو بالکل نظرانداز کرکے مجرد اپنے ذاتی مفاد کے پیشِ نظر ایک امرِ حق کے اظہار سے جی چراتا ہے یا اس سے غفلت برتتا ہے تو صرف بعض مستثنیٰ حالات ہی میں اس کی اجازت ہے۔ مثلاً یہ کہ آدمی کی جان کے لئے کوئی واقعی خطرہ ہو اور اس امر کو محسوس کرتا ہو کہ اس وقت حق کی خدمت کے نقطۂ نظر سے بھی زیادہ بہتر یہی ہے کہ وہ اپنی جان بچالے جائے۔ اس طرح کے کسی واقعی خطرہ کے بغیر اگر کوئی شخص اظہارِ حق سے جی چراتا ہے تو یا تو وہ منافق ہے یا کم از کم بے غیرت اور بے حمیت۔

تیسری شرط

تیسری شرط یہ ہے کہ یہ شہادت صرف قول ہی سے نہ دی جائے' بلکہ عمل سے بھی دی جائے۔ اسلام میں وہ شہادت معتبر نہیں ہے جس کے ساتھ عمل کی تائید و توثیق موجود نہ ہو۔ بعض لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے اور آپؐ کے سامنے بسا اوقات قسمیں کھا کھا کر کہتے کہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں' لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس شہادت کو تسلیم نہیں کیا' فرمایا کہ یہ لوگ منافق اور جھوٹے ہیں

اور اس کے ثبوت میں ان کے اعمال و اقوال کو ان کے سامنے رکھ دیا جن سے صاف اسلام اور مسلمانوں کی بدخواہی اور حق دشمنی نمایاں تھی۔ جو شخص ایک امر کو حق مانتا ہے اور لوگوں کو اس کی دعوت بھی دیتا ہے اس کے لئے لازمی ہے کہ اس کا عمل بھی اس کے موافق ہو' ورنہ وہ ان علمائے یہود کے نقشِ قدم کا پیرو ہے جن کو قرآن نے ملامت کی ہے کہ تم دوسروں کو تو خدا کے ساتھ وفاداری کی دعوت دیتے ہو' لیکن خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ جس آدمی یا جس گروہ کا رویہ اس کی دعوت کے خلاف ہے وہ درحقیقت اپنی دعوت کی تردید کے دلائل خود پیش کرتا ہے۔ اور عمل کی دلیل چونکہ قول کی دلیل سے زیادہ قوی ہے اس وجہ سے خود اس کا رویہ اس کے دعویٰ کے خلاف ایسی حجت ہے کہ اس کے بعد اس کی تردید کے لئے کسی اور حجت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مسلمان اگر اللہ کے دین کے شاہد ہیں تو اس کا لازمی تقاضا ہے کہ اس پر ایمان بھی لائیں' اس کی دعوت بھی دیں اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں اس پر عمل بھی کریں' ورنہ اس شہادتِ کا حق ادا نہیں ہوسکتا جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو مامور کیا ہے۔ زندگی کے عملی معاملات میں اس دین سے منحرف رہنا اور زبان سے اس کے حق ہونے کی شہادت دینا خلق کے اوپر اتمامِ حجت کے نقطۂ نظر سے ایک بالکل ہی لغو حرکت ہے۔ ایسے بے عمل واعظوں کے وعظوں کی بناء پر اللہ تعالیٰ اگر اپنی مخلوق کو مجرم ٹھہرائے تو یہ بات اس کے عدل کے خلاف ہوگی۔ البتہ اس کا یہ نتیجہ ضرور نکلے گا کہ خود مسلمانوں پر اس دین کی حجت پوری طرح تمام ہوجائے گی اور قیامت کے دن وہ اپنے ہی اقراروں پر پکڑے جائیں گے۔ عملی معاملات میں دین سے انحراف کی جو شکلیں قابل درگذر ہیں ان کو قرآن نے خود بیان کردیا ہے اور ساتھ ہی ان کا علاج بھی بتادیا۔ اس کی ایک شکل تو یہ ہے کہ جذبات یا شہوات کے غلبہ سے آدمی کا کوئی قدم حق کے خلاف اٹھ جائے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ آدمی فوراً توبہ کرے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی حق سے انحراف پر مجبور کردیا جائے۔ اس کی تلافی کی تدبیر یہ ہے کہ آدمی اس چیز سے نکلنے کے لئے جدوجہد کرے۔ اگر توبہ اور اصلاح کی جدوجہد کی بجائے آدمی اپنی غلطی ہی کو اوڑھنا بچھونا بنا لے اور جس حالتِ اضطرار میں گرفتار ہوگیا ہے اس کو دین و مذہب قرار دے بیٹھے تو شہادت علی الناس کے جس منصب پر وہ مامور کیا گیا تھا' باطل پر اس کی اس قناعت نے

اس سے اسے خود بخود ہٹا دیا۔

چوتھی شرط

چوتھی شرط یہ ہے کہ یہ شہادت ہر قسم کی قومی و گروہی عصبیت سے بالا تر ہو کر دی جائے۔ نہ کسی قوم کی دشمنی ہمیں اس حق سے منحرف کر سکے جس کے ہم داعی ہیں اور نہ کسی قوم کی حمایت و حمیت کا جذبہ اس سے ہمیں منحرف کر سکے۔ اپنے مخالفوں کے مقابلہ میں ہمیں جس طرح بے لاگ ہونا چاہئے' اس کی تعلیم قرآن نے ان الفاظ میں دی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ (المائدہ - ۵:۸)

"اے ایمان والو! عدل کے علم بردار بنو' اللہ کے لئے اس کی شہادت دیتے ہوئے' اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم عدل نہ کرو"۔

اور اپنے دوستوں اور عزیزوں کے مقابل میں جس طرح بے لوث ہونا چاہئے' اس کی تعلیم اس طرح دی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ (النساء - ۴:۱۳۵)

"اے ایمان والو! حق پر جمے رہو' اللہ کے لئے اس کی شہادت دیتے ہوئے' اگرچہ یہ شہادت خود تمہاری اپنی ذات' تمہارے والدین اور تمہارے قرابت مندوں کے خلاف ہی پڑے۔"

پانچویں شرط:

پانچویں شرط یہ ہے کہ اس پورے حق کی شہادت دی جائے جو خدا کی طرف سے اترا ہے' کسی ملامت یا مخالفت کے اندیشہ سے اس میں سے کوئی چیز کم نہ کی جائے۔ جن چیزوں کی شہادت انفرادی زندگی کے فرائض میں ہے ان کی شہادت افراد اپنی انفرادی زندگیوں میں دیں۔ نماز ہر شخص پڑھے۔ روزہ ہر شخص رکھے۔ زکوٰۃ ہر صاحبِ مال دے۔ حج ہر صاحبِ استطاعت کرے۔ نیکی' دیانت داری' راست بازی اور پاک بازی کی زندگی ہر مسلمان اختیار کرے۔ البتہ جن چیزوں کی شہادت کے لئے اجتماعی زندگی شرط ہے

اس کے لئے افراد کا فرض ہے کہ جماعتی زندگی پیدا کرنے کے لئے جدوجہد کریں اور جب وہ وجود میں آجائے تو اس کی شہادت دیں۔ مثلاً معاشرت و معیشت کا اجتماعی نظام اور ملک کا سیاسی نظم و نسق افراد کے بس کی چیز نہیں ہے۔ اس کو اسلامی ڈھانچہ میں ڈھالنے کے لئے ایک جماعت کی قوت درکار ہے۔ اس وجہ سے اس سلسلہ میں سب سے مقدم ضرورت ایک صالح جماعت کے قیام کی ہے۔ اس جماعت کے قیام کے بعد اجتماعی زندگی کے ہر گوشہ میں بھی اس حق کی شہادت واجب ہوجائے گی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اترا ہے۔ ذیل میں ہم چند آیتیں نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ کس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے دین کی' بغیر کسی کمی بیشی کے' دعوت کی تاکید کی گئی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۭ (المائدہ-۵:۶۷)

"اے رسول! تمہاری طرف جو چیز تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے اس کو اچھی طرح پہنچا دو' اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا"۔

اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ۭ

(الاحزاب- ۳۳:۳۹)

"وہ اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔"

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ ۭ

(الاحزاب- ۳۳:۴۸)

"اور کافروں اور منافقوں کی بات کا دھیان نہ کرو۔ اور ان کی ایذا رسانیوں کو نظر انداز کرو' اور اللہ پر بھروسہ رکھو"۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ (الشوریٰ- ۴۲:۱۵)

"پس تم اسی دین کی دعوت دو اور اس پر جمے رہو' جیسا کہ تم کو حکم ہوا ہے' اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجیو۔ اور اعلان کردو کہ اللہ نے جو کتاب اتاری

ہے میں اس پر ایمان لایا ہوں۔"

چھٹی شرط:

چھٹی شرط یہ ہے کہ جب ضرورت داعی ہو' اللہ کے دین کی شہادت جان دے کر دی جائے۔ یہ شہادت کا سب سے اونچا مرتبہ ہے۔ اسی وجہ سے ان لوگوں کو جنہوں نے اللہ کے دین کو برپا کرنے کے لئے جہاد کیا اور جس حق پر ایمان لائے تھے اس کے حق ہونے کی گواہی تلواروں کی چھاؤں میں بھی دی' ان کو شہید کہا گیا ہے اور غور کیجئے تو ان لوگوں کے سوا نہ اس لقب کا کوئی اور مستحق ہو سکتا ہے اور نہ اس لقب کے سوا کوئی اور لقب ان کے لئے موزوں ہو سکتا ہے۔ اس امت پر شہادت علی الناس کی جو ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی گئی ہے اس کو پورا کرنے والے ہزاروں لاکھوں ہو سکتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی محنت کا اللہ کے ہاں اجر بھی پائے گا' لیکن جنہوں نے اس راہ میں اپنا پورا سرمایۂ زندگی لگایا اور اپنے سر دے کر اس حق کی گواہی دی' درحقیقت وہی اس بات کے اہل ہیں کہ ان کو شہید کا لقب ملے کیونکہ ایک چیز کے حق ہونے کی اس سے بڑی شہادت کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ آدمی اس کی حمایت و نصرت کی راہ میں سر کٹا دے۔ پس جو ہمت ور یہ بازی کھیل گیا اس نے وہ شہادت دے دی جس کے بعد شہادت کا کوئی اور درجہ باقی نہ رہا۔

مسلمانوں کا فرضِ منصبی

یہی فریضۂ رسالت ہے جس کی وجہ سے اس امت کو "خیرِ امت" کہا گیا ہے۔ اگر مسلمان اس فرضِ منصبی کو بھلا دیں تو یہ دنیا کی قوموں میں سے بس ایک قوم ہیں' نہ ان کے اندر کوئی خاص خوبی ہے' نہ کوئی خاص وجہ فضیلت اور نہ پھر اللہ تعالیٰ کو اس بات کی پروا ہے کہ وہ دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں یا ذلت کے ساتھ۔ بلکہ اس فرض کو فراموش کر دینے کے بعد وہ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ایک معتوب قوم بن جائیں گے جس طرح دنیا کی دوسری قومیں' جو خدا کی طرف سے کسی منصب پر سرفراز کی گئی تھیں' اپنا فرض انجام نہ دینے کی وجہ سے معتوب ہو گئیں۔ چنانچہ جس آیت میں مسلمانوں کے "خیرِ امت" ہونے کا ذکر ہے اسی میں ان کی ذمہ داری بھی واضح کر دی گئی ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران - ۳: ۱۱۰)

"تم بہترین امت ہو' لوگوں کی رہنمائی کے لئے مبعوث کئے گئے ہو' معروف کا حکم دیتے ہو' منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔"

اسی جماعتی فرض کو ادا کرنے کی باضابطہ صورت خود اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی یہ ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ (آل عمران - ۳: ۱۰۴)

اور چاہئے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جو نیکی کی دعوت دے' معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اس حکم کی تعمیل میں مسلمانوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ ٹھیک ٹھیک نبوت کے طریق پر خلافت کی بنیاد رکھی۔ یہ ادارہ نیکی کی دعوت' معروف کے حکم اور منکر سے روکنے کا ایک جماعتی ادارہ تھا جو مسلمانوں نے اس لئے قائم کیا کہ اس جماعتی فرض کو انجام دے سکیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت کو حق پر استوار رکھنے اور دنیا کو حق کی دعوت دینے کے لئے اس امت پر ڈالا گیا تھا۔ جب تک یہ ادارہ صحیح طریقہ پر قائم رہا اور اپنے فرائض مسلمانوں کے اندر بھی اور مسلمانوں سے باہر بھی انجام دیتا رہا ہر مسلمان اس فرض سے سبکدوش رہا جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے عائد کیا گیا تھا۔ اس وقت تک تبلیغ کا فرض ایک فرض کفایہ تھا اور جماعت کا ادارہ اس کو انجام دے کر جماعت کے تمام افراد کو اس فرض کی ذمہ داری سے عند اللہ بری کر دیتا تھا۔ لیکن جب یہ نظام درہم برہم ہوگیا تو جس طرح کسی ملک کا یا سی نظام درہم برہم ہوجانے کے بعد اس کے باشندوں کے جان ومال کی ذمہ داری خود ان کے اوپر منتقل ہوجاتی ہے اور جب تک وہ از سرِ نو اپنے نظامِ سیاسی کو درست نہ کرلیں ان میں سے ہر شخص اپنی حفاظت کا بوجھ خود اٹھاتا ہے اسی طرح نظامِ خلافت کے درہم برہم ہوجانے کے بعد اب یہ فریضۂ شہادت علی الناس اس امت کے تمام افراد پر منتقل ہوگیا ہے اور جب تک وہ اس کو انجام دینے کے لئے اس صالح اسلامی نظام کو قائم نہ کردیں جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اس وقت تک اس فریضہ کے ادا نہ

ہونے کا گناہ ہر مسلمان کے ذمہ ہے اور قیامت کے دن اس کی پرسش ہر شخص سے ہوگی۔

خلاصۂ بحث

اس پوری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے:

(ا) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام دنیا میں قیامت تک کے لئے تبلیغ دین کی جو ذمہ داری ڈالی گئی تھی اس کی طرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رہنمائی فرما کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تکمیل کا کام اپنی امت کے سپرد فرمایا تاکہ یہ امت ہر ملک' ہر قوم اور ہر زبان میں قیامت تک اس دین کی تبلیغ کرتی رہے۔

(ب) اس تبلیغ کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ شرط مقرر ہے کہ یہ دل سے کی جائے' زبان سے کی جائے' عمل سے کی جائے۔ بلا تقسیم و تفریق' پورے دین کی کی جائے۔ بے خوفِ لومۃ لائم اور بے رو رعایت کی جائے۔ اور اگر ضرورت داعی ہو تو جان دے کر کی جائے۔

(ج) اس جماعتی فرض کی ادائیگی کا باضابطہ ادارہ خلافت کا ادارہ تھا اور جب تک یہ ادارہ موجود تھا ہر مسلمان اس فرض کی ذمہ داریوں سے سبکدوش تھا۔

(د) اس ادارہ کے منتشر ہوجانے کے بعد اس فرض کی ذمہ داری امت کے تمام افراد پر ان کے درجہ اور استعداد کے لحاظ سے تقسیم ہوگئی۔

(ہ) اب اس فرض کی مسئولیت اور ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لئے دو ہی راہیں مسلمانوں کے لئے باقی رہ گئی ہیں: یا تو اس ادارہ کو قائم کریں یا کم ازکم اس کو قائم کرنے کے لئے سردھڑ کی بازی لگائیں۔

(و) اگر مسلمان ان میں سے کوئی بات نہ کریں تو وہ اس فرضِ رسالت کو ادا نہ کرنے کے مجرم ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے سپرد کیا گیا ہے اور صرف اپنی ہی غلط کاریوں کا وبال اپنے سر نہ لیں گے' بلکہ خلق کی گمراہی کا وبال بھی ان کے سر آئے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ تبلیغ کے لئے اصل محرک درحقیقت اس

فرض عظیم کا احساس ہے جو مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالا گیا ہے اور اس میں جو چیز بطور مطمح نظر اس وقت پیش نظر رکھنی ہے وہ یہ ہے کہ وہ نظام دعوت خیر پھر وجود میں آجائے جو خلق کو اللہ کے دین کی راہ بتا سکے اور دنیا پر اتمام حجت کر سکے۔ جب تک یہ چیز دنیا میں موجود نہیں ہے ہر مسلمان کا سب سے مقدم اور سب سے بڑا اور سب سے اعلیٰ مقصد یہی ہے کہ اس کو وجود میں لانے کے لئے جو کچھ کر سکتا ہے کرے۔ اسی کے لئے مرنا اور جینا چاہئے۔ اس کے بغیر مسلمانوں کی زندگی خدا کے منشا کے بالکل خلاف ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ اپنی اس کوتاہی کے لئے کوئی عذر نہ کر سکیں گے۔ یہ چیز ان کی ہستی کی غایت ہے۔ اگر اس کو انہوں نے کھو دیا تو جس طرح وہ تمام چیزیں جو اپنے مقصد وجود کو کھو کر کوڑے کرکٹ میں شامل ہو جاتی ہیں اسی طرح یہ بھی اس زمین کے خس وخاشاک سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے اور ان کے لئے یہ ہرگز زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو امت وسط یا خیر امت کے لقب کا مستحق سمجھیں یا اللہ تعالیٰ سے کسی نصرت و حمایت کی امید رکھیں۔

بقیہ: الھدیٰ

وخاشاک کی طرح اڑا کر منتشر کر دیگی۔ یہیں سے وہ دور شروع ہوا جسے سیرت کی کتابوں میں "تعذیب المسلمین" یعنی مسلمانوں پر تشدد اور بہیمانہ تشدد (Persecution) کا دور کہتے ہیں۔ کفار کی طرف سے جب مسلمانوں پر شدید جسمانی تشدد کیا جانے لگا تو بعض مسلمانوں کو کچھ گھبراہٹ لاحق ہوئی۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورۂ عنکبوت میں بھرپور خطاب وارد ہوا۔ چنانچہ صبر و مصابرت کی بحث میں قرآن کا جو اولین مقام ہمارے اس منتخب نصاب میں شامل ہے وہ سورہ عنکبوت کے پہلے رکوع پر مشتمل ہے۔ اب اسی پر آئندہ گفتگو ہوگی۔ ان شاء اللہ!

مولانا مودودی مرحوم اور مسئلہ بیعت

کے ضمن میں
امیر تنظیم اسلامی کی رائے پر ادارہ 'تکبیر' کراچی کا محاکمہ
اور ڈاکٹر صاحب کی وضاحت

"میثاق" کے گذشتہ شمارے میں نیویارک میں مقیم جماعت اسلامی سے دیرینہ تعلق رکھنے والے ہمارے ایک قابلِ احترام بزرگ جناب شمیم احمد صدیقی صاحب کا مفصل مراسلہ شائع کیا گیا تھا جنہوں نے اسلام کے حرکی اور انقلابی فکر کی بیخ کنی کی ایک مذموم اور بھونڈی کوشش پر اظہارِ رنج کیا اور مدیر 'اشراق' سے احتجاج کیا تھا۔ جیسا کہ صدیقی صاحب کے مراسلے کے مندرجات سے ظاہر ہے کہ جناب صدیقی صاحب دین کی حرکی و انقلابی تصور میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے پورے طور پر متفق اور اس تصور کی ترویج و اشاعت میں ان کے ہم زبان ہیں تاہم بیعت کے معاملے میں انہیں محترم ڈاکٹر صاحب کے خیالات سے اتفاق نہیں ہے۔ بلکہ ہیئتِ تنظیمی کے ضمن میں جماعت اسلامی نے جو طریق کار اختیار کیا' وہ اسی کو درست سمجھتے ہیں --- یادش بخیر' ۱۹۸۶ء میں ہفت روزہ "تکبیر" کراچی میں محترم ڈاکٹر صاحب کا ایک انٹرویو شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ مولانا مودودی مرحوم بھی نظامِ بیعت کے حامی و قائل تھے۔ اس پر مدیر تکبیر جناب صلاح الدین صاحب نے ۲۷ر فروری کے شمارے کے ادارتی نوٹ میں محترم ڈاکٹر صاحب کی رائے سے اظہار اختلاف کرتے ہوئے مولانا مودودی مرحوم کے دو خطوط شائع کئے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مولانا مودودی نظامِ بیعت کے قائل نہیں تھے۔ اس کے جواب میں امیر تنظیم نے جو مدلل وضاحتی مراسلہ انہیں ارسال کیا اس میں اصل معاملے کی پوری وضاحت موجود تھی کہ اصلاً مولانا مودودی بھی شدومد کے ساتھ اس کے قائل تھے کہ امیر کو ویٹو کا حق حاصل ہونا چاہیے' لیکن بوجوہ وہ اپنے اصل ذہن و فکر کو بروئے کار نہیں لاسکے! یہ پوری بحث ہم اس خیال سے شاملِ اشاعت کر رہے ہیں کہ اس میں محترم شمیم صدیقی صاحب اور ان کے ہم خیال لوگوں کے لئے غور و فکر کا بہت کچھ سامان موجود ہے!

(ادارہ)

۱- ہفت روزہ "تکبیر" بابت ۲۱ تا ۲۷ فروری ۱۹۸۶ء کے ادارتی نوٹ کا عکس

طریقۂ بیعت ڈاکٹر اسرار احمد اور مولانا مودودیؒ

بانیٔ جماعتِ اسلامی کا اصل موقف ان کے مکاتیب کی روشنی میں

تکبیر کے گزشتہ شمارے میں تنظیم اسلامی کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ایک طویل انٹرویو شائع ہوا تھا، جس میں ڈاکٹر صاحب نے بیعت سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ مولانا مودودیؒ بھی نظامِ بیعت کے حامی تھے اور اس معاملہ میں ان کی فکر بالکل وہی تھی جو آج میں پیش کر رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے تشکیل جماعت سے ۶ ماہ قبل مولانا کی جانب سے حیدر آباد دکن کے محمد یونس صاحب کے نام مارچ ۱۹۴۱ء میں لکھے جانے والے ایک خط کا حوالہ دیا تھا۔ اس خط کے مکمل متن کا جائزہ لیا گیا تو ریکارڈ پر تشکیل جماعت سے ٹھیک ۱۰ ماہ بعد ۲۸ جون ۱۹۴۲ء کو انہی محمد یونس صاحب کے نام مسئلہ بیعت ہی پر مولانا محترم کا ایک دوسرا خط بھی موجود پایا گیا جس میں انہوں نے اپنا نقطۂ نظر بڑی وضاحت اور جامعیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب شخصی بیعت کے داعی ہیں جبکہ مولانا مودودیؒ کا موقف یہ ہے کہ "بیعت کسی شخص کی طرف منسوب نہ ہو بلکہ اسلام کی طرف منسوب ہو تاکہ شخص خاص سے وابستگی آگے چل کر شخصیت پرستی تک نہ پہنچ جائے۔" ان کے نزدیک "اطاعت نظام کی ہونی چاہیے نہ کہ کسی شخصِ خاص کی"۔

ہم قارئین کی رہنمائی اور دلچسپی کے لئے مولانا مودودیؒ کے ان دونوں خطوط کا متن شائع کر رہے ہیں تاکہ وہ بیعت کے مسئلہ پر مولانا مودودیؒ کے نقطۂ نظر سے پوری طرح باخبر ہو سکیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور مولانا مودودیؒ کے موقف کا فرق ان پر واضح ہو جائے اور اس سلسلہ میں کسی غلط فہمی کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

۲- مولانا مودودی مرحوم کے خطوط (غیر متعلق حصے حذف کر دیئے گئے ہیں)

لاہور

مارچ ۱۹۴۱ء

محترمی و مکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ اصطلاح میں بیعت سے مراد اطاعت اور پیروی کا اقرار ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں:

۱- وہ بیعت جو کسی خاص موقع پر کسی خاص معاملہ کے لئے ہوئی ہو۔ جیسے بیعتِ رضوان تھی کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی افواہ سن کر حضورؐ نے اہل مکہ سے جنگ کا ارادہ فرمایا اور اس وقت صحابہ کرامؓ سے اس امر پر بیعت لی کہ وہ پیش آیدہ مہم میں آپ کے ساتھ جان فروشی کریں گے۔

۲- دوسری وہ بیعت جو تزکیۂ نفس اور اصلاحِ اخلاق و روحانیت کی نیت سے ایک مرشد و معلّم اس شخص سے لیتا ہے جو اس کے پاس تربیت حاصل کرنے کے لئے آئے۔ یہ وہ بیعت تھی جو بالعموم اس شخص کو کرنی پڑتی تھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ایمان لاتا تھا۔ آپؐ اس سے اقرار کراتے تھے کہ شرک، زنا، چوری وغیرہ سے پرہیز کرے گا اور جو احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے

آپ پہنچائیں گے ان کی اطاعت کرے گا۔ اس بیعت کے لینے کا حق یا تو نبی کو پہنچتا ہے یا اس شخص کو جو نبی کے طریقہ پر ہو۔ یعنی طریقہ نبوی کا صحیح علم بھی رکھتا ہو، اس پر خود بھی عامل ہو اور بیعت لینے سے اصلاح و ارشاد کے سوا قطعاً کوئی دوسری نیت نہ رکھتا ہو۔

۳۔ تیسری بیعت وہ ہے جو اسلامی جماعت کے امیر یا امام کے ہاتھ پر کی جاتی ہے۔ اس کی نوعیت یہ ہے کہ جب تک امیر یا امام اللہ اور اس کے رسولؐ کا مطیع ہے، اس وقت تک جماعت کے تمام ارکان پر اس کی اطاعت فرض ہے۔ "من مات ولیس فی عنقہ بیعۃ" اور دوسری تمام احادیث میں جس بیعت کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے ان میں سے مراد تیسری بیعت ہے کیونکہ اس پر اسلامی جماعت کی زندگی اور اس کے نظام کا قیام منحصر ہے۔ اس سے الگ ہونے یا الگ رہنے کے معنی یہ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس کام کے لئے تشریف لائے تھے اور جس امر عظیم کا بار آپؐ امت پر چھوڑ گئے ہیں اس کو نقصان پہنچایا جائے یا ختم کر دیا جائے۔

صوفیائے کرام میں جو بیعت رائج رہی ہے، وہ دوسری قسم کی ہے اور وہ کوئی ضروری چیز نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص دین کا علم حاصل کرے اور احکام کو سمجھ کر ان کی پیروی کرنے کی کوشش کرے بغیر اس کے کہ کسی روحانی مربی کی بیعت اس کی گردن میں ہو، تو وہ نہ کوئی گناہ کرتا ہے نہ آخرت میں اس سے کوئی باز پرس اس امر کی ہوگی کہ اس نے کسی پیر کا ہاتھ کیوں نہیں پکڑا۔ البتہ اگر کوئی دیندار، متبع شریعت، صاحب اخلاق فاضلہ شخص اس کو مل جائے جس کی زندگی کو دیکھ کر اسے یقین ہو جائے کہ فی الواقع وہ جانشین پیغمبرؐ ہونے کا شرف رکھتا ہے تو اس کے ہاتھ پر بیعت کر لینا فائدہ سے خالی نہیں ہے بشرطیکہ بیعت کرنے والا خود بھی دین کا علم رکھتا ہو اور اپنے شیخ کا اندھا مقلد نہ ہو اور شیخ سے بشری کمزوری کی بناء پر اگر شریعت کے خلاف کچھ باتیں سرزد ہو جائیں تو مرید عقیدت مندی میں ان غلط باتوں میں بھی شیخ کی پیروی کرتا نہ چلا جائے۔ رہی موجودہ زمانہ کی پیری مریدی جس میں اصلاح و ارشاد کا نام و نشان بھی نہیں ہوتا بلکہ بندگوں کی گدیوں پر بیٹھ کر ان کے نالائق، بے علم، بداعمال جانشین اللہ کے بندوں کو اپنا بندہ بناتے ہیں اور لوگوں کو اس دھوکہ میں ڈالتے ہیں کہ بس ہمارا ہاتھ پکڑ لینے کے بعد تمہارے لئے جنت واجب ہو جائے گی اور مریدوں سے اس طرح نذرانے وصول کرتے ہیں کہ گویا کہ وہ زمیندار ہیں اور اپنی اسامیوں سے لگان وصول کر رہے ہیں تو ایسی پیری مریدی کا واجب ہونا تو درکنار یہ جائز بھی نہیں ہے۔ یہ تو ایک معصیت ہے۔ بلکہ میرے نزدیک اس کا شمار کبائر میں ہے۔ میں ان پیروں کو بدترین مجرم اور ان کے مریدوں کو سخت گمراہ سمجھتا ہوں۔ اگر میرے ہاتھ میں طاقت ہوتی تو میں بجبر اس گمراہی کو روک دیتا۔

اعتقاد اور عمل دو مختلف چیزیں ہیں۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کے ساتھ غیر منفک تعلق رکھتے ہیں۔ اعتقاد نام ہے اس رائے یا خیال کا جس پر آدمی پختگی کے ساتھ قائم ہو۔ اور اس رائے یا خیال کے مطابق کام کرنے کا نام عمل ہے۔ ان دونوں کو ایک نہیں کہا جا سکتا، لیکن یہ دونوں مل کر ایک زندگی بناتے ہیں اور صحیح اعتقاد اور عمل میں مطابقت کا نام ہی اسلامی زندگی ہے۔

خاکسار
ابوالاعلیٰ

لاہور
۲۸ جون ۱۹۴۲ء

محترمی و مکرمی
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

عنایت نامہ ملا۔ الحمد للہ کہ آپ کی غلط فہمی کسی حد تک رفع ہو گئی۔ اصل یہ ہے کہ ایک چیز تو طریقہ بیعت و ارشاد کی روح ہے اور دوسری چیز وہ خالص ہیئت و شکل ہے جس میں یہ طریقہ صدیوں سے متوارث چلا آ رہا ہے۔ جہاں تک اس کی اصل روح کا تعلق ہے

وہ بالکل برحق صحیح اور پاک ہے مگر جہاں تک اس کی ہیئت و شکل کا تعلق ہے وہ گمراہ کرنے والے پیروں اور جاہل مریدوں کے غلط طرزِ عمل کی وجہ سے اس قدر انحطاط کی شکار ہو گئی ہے اور اس کے ساتھ کچھ دوسرے خراب لوازم اس قدر غلط ملط ہو گئے ہیں کہ اصل روح نہ صرف یہ کہ اس کے اندر باقی نہیں رہی بلکہ جہاں نیک نیت لوگ اس ہیئت و شکل میں کوئی صحیح خدمت بھی کرتے ہیں وہاں بھی بہت جلد ہی اس کے خراب لوازم عود کر آتے ہیں۔ اس بنا پر میری یہ رائے ہے کہ پیری مریدی کی وہ خاص شکل بدل دی جائے اور اس کے بجائے ایک دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے جس میں سلسلہ بیعت و ارشاد کی اصل روح تو موجود ہو مگر وہ خراب لوازم اور التباسات نہ ہوں۔ میں نے بہت غور و خوض کے بعد جو صورت تجویز کی ہے وہ یہ ہے کہ اوّلاً ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت نہ لی جائے۔ بلکہ صرف زبانی عہد لیا جائے۔ جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں سے لیا کرتے تھے۔ ثانیاً سلسلہ کسی شخص کی طرف منسوب نہ ہو۔ بلکہ "اسلام" کی طرف منسوب ہو تاکہ شخصِ خاص کی وابستگی آگے چل کر شخصیت پرستی تک نہ پہنچ سکے۔ ثالثاً تزکیۂ نفس اور احیائے احکام اور ساقامتِ نظم و انضباط وغیرہ کا کام جس شخص کے ہاتھ میں ہو وہ اس کی ذاتی حیثیت میں نہ ہو بلکہ جماعت کا سردار ہونے کی حیثیت میں ہو۔ حتیٰ کہ جب ایک شخص سرداری سے الگ ہو دوسرا شخص اس کی جگہ آئے تو لوگوں کی اطاعت و وابستگی بھی پہلے شخص سے ہٹ کر دوسرے شخص کی طرف منتقل ہو جائے۔ نہ یہ کہ لوگ اسی شخصِ خاص کے گرویدہ رہیں جس کے امر پر ابتدا میں انہوں نے عہد کیا تھا۔ یہ دونوں باتیں خلفائے راشدین کے دور کی تنظیم سے میں نے اخذ کی ہیں۔ ان کے مبارک دور میں اسلامی جماعت اسلام کی طرف منسوب تھی نہ کہ صدیقؓ یا فاروقؓ یا عثمانؓ یا علی رضی اللہ عنہم کی طرف۔ اسی طرح لوگوں کی وابستگی شخص صدیقؓ یا شخصِ فاروقؓ سے نہ تھی بلکہ امیر المومنین سے تھی جو بھی وقت کا امیر ہو۔ اور اطاعت و نظام کی تھی نہ کہ شخصِ خاص کی۔

آپ نے "جماعت اسلامی" میں اپنے آپ کو تیسرے درجہ کی ممبری کے لیے پیش کیا ہے اللہ آپ کو درجہ دوم بلکہ درجہ اول تک ترقی کرنے کی توفیق بخشے....

خاکسار
ابوالاعلیٰ مودودی

۳۔ امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی وضاحت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترمی مدیر "تکبیر" ——— السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

"تکبیر" کی اشاعت بابت ۲۱ر تا ۲۷ فروری ۸۶ء میں "بیعت" سے متعلق میرے انٹرویو میں وارد شدہ ایک رائے کا محاکمہ مولانا مودودی مرحوم کے دو خطوط کے حوالے سے کیا گیا ہے ——— اس ضمن میں یہ چند سطور پیش خدمت ہیں جن کی حیثیت ایک جانب ذاتی وضاحت کی ہے اور دوسری جانب ایک واقعاتی تحقیق کی۔ امید ہے آپ ان

کی اشاعت کے لئے گنجائش نکال لیں گے۔

میرا تنظیمِ اسلامی کے لئے بیعت کے نظام کو اختیار کرنا ہرگز اس دلیل پر مبنی نہیں ہے کہ مولانا مودودی مرحوم اس کے قائل تھے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ میرے علم میں مولانا کا موقف تو اتفاقاً آج سے صرف تین چار سال قبل حیدر آباد دکن کے مولانا محمد یونس مرحوم کے نام مولانا مرحوم کے کتابی شکل میں شائع شدہ خطوط کے ذریعے آیا۔ جبکہ میرا یہ ذہن کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کرنے والی جماعت کا تنظیمی ڈھانچہ "بیعتِ جہاد" اور "بیعتِ سمع و طاعت فی المعروف" کی اساس پر قائم ہونا چاہئے' جماعت سے علیحدہ ہونے کے دو سال بعد ہی اوائل ۱۹۵۹ء میں بن چکا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ میری ذاتی رائے تھی جسے میں اپنے بزرگوں پر کسی طرح مسلط نہیں کرسکتا تھا' لہٰذا جب ۱۹۶۷ء میں رحیم یار خان میں جماعت سے علیحدہ ہونے والے بعض حضرات کا اجتماع ہوا اور اس میں ایک نئی تنظیم کے قیام کا فیصلہ ہوگیا اور اس کے لئے تنظیمی ڈھانچہ طے کرنے کے لئے سات افراد پر مشتمل ایک مجلس مقرر کردی گئی تو اگرچہ میں بھی ان سات میں کا "ساتواں" تھا لیکن مجھے ہرگز یہ امکان نظر نہ آتا تھا کہ اس تنظیم کی اساس بیعت پر ہوسکتی ہے۔ اس لئے کہ ان سات افراد میں ہر اعتبار سے اولین اور اہم ترین شخصیت مولانا امین احسن اصلاحی کی تھی جن کے مزاج سے میں بخوبی واقف تھا' تاہم میں چونکہ دوسرے مروجہ طریق ہائے تنظیم کو بھی حرام نہیں بلکہ مباحات میں سے سمجھتا ہوں لہٰذا میں ذہناً اس کے لئے بالکل تیار تھا کہ نظام خواہ کوئی بھی ہو اگر اقامتِ دین کے لئے طریق کار درست ہو تو لازماً شریک رہوں گا ـــــ یہ دوسری بات ہے کہ بیل منڈھے تو کیا چڑھتی سرے اچ ہی نہ سکی ـــــ اس کے بعد ۱۹۷۵ء میں میں نے تنظیم اسلامی کے قیام کا فیصلہ کیا تو اس کے لئے قرار دادِ تاسیس بھی وہی رکھی جس پر ۱۹۶۷ء میں اتفاق ہوا تھا اور نظامِ جماعت کے معاملے کو بھی کھلا (open) رکھا کہ تین سال تک میری حیثیت صرف داعی (convener) کی ہوگی۔ اور اس عرصے کے دوران جو حضرات قرار دادِ تاسیس پر اتفاق کرتے ہوئے جمع ہوجائیں گے وہ باہمی مشورے سے مستقل نظام طے کریں گے!ـــــ لیکن جب اڑھائی سال انتظار کے بعد بھی بزرگوں میں سے کسی نے پیش قدمی نہیں فرمائی تو بالآخر میں نے جولائی ۱۹۷۷ء میں ساتھیوں کے سامنے اپنا ذہن

کھول کر رکھا۔ نتیجۃً "بیعت" ہی کو تنظیم کی مستقل اساس کے طور پر اختیار کر لیا گیا۔

اس کے بعد جب ۸۳۔۱۹۸۲ء میں "خطوط کے چراغ" نامی کتاب حیدر آباد دکن سے آئی اور اس سے معلوم ہوا کہ مارچ ۱۹۴۱ء کے خط میں مولانا مودودی مرحوم نے بالکل وہی بات فرمائی تھی جس کا میں قائل ہوں تو اس پر فطری طور پر مجھے خوشی بھی ہوئی کہ ع "متفق گردید رائے بو علی با رائے من!" اور اپنی بات پر مزید اطمینان بھی ہوا لیکن ظاہر ہے کہ میرا موقف مولانا مرحوم کی رائے کی بنیاد پر نہیں بلکہ اپنے مطالعہ کے مطابق قرآن حکیم اور سنت و سیرت رسولؐ کی محکم اساسات اور امت کے طویل تعامل پر قائم ہے!

البتہ جہاں تک علمی اعتبار سے مولانا مودودی مرحوم کے موقف کی تحقیق کا سوال ہے تو جو خطوط آپ نے شائع کئے ہیں ان میں حسب ذیل امور پر معروضی طور پر توجہ کی ضرورت ہے:

(۱) مولانا مرحوم کا مارچ ۱۹۴۱ء والا خط نہایت واضح ہے'۔۔۔ اس میں انہوں نے بیعت کی بظاہر تین لیکن حقیقتاً چار اقسام بیان کی ہیں' ایک خاص مواقع پر خاص کاموں کے لئے کی جانے والی بیعت (۲) بیعتِ ارشاد و سلوک اور (۳) بیعتِ نظم و جماعت۔ اس آخری بیعت کے ضمن میں دوبار مولانا نے "امیر یا امام" کے الفاظ التزاماً استعمال کئے ہیں جن سے (جیسا کہ بعض دیگر شواہد سے ثابت ہوگا جن کا ذکر بعد میں آئے گا) اس کی دو قسمیں بنتی ہیں' یعنی ایک یہ کہ اگر صحیح اسلامی حکومت قائم ہو تو اس کے سربراہ سے بیعت اور دوسری اس صورت میں کہ صحیح اسلامی حکومت قائم نہ ہو تو اس کے لئے جدوجہد کرنے والی جماعت کے امیر سے بیعت!

(۲) اس کے بعد مولانا نے دوسری قسم کی بیعت یعنی بیعتِ ارشاد و سلوک کے بارے میں یہ رائے بھی ظاہر کی ہے کہ وہ کوئی ضروری چیز نہیں ہے۔۔۔۔ اور پھر اس میں دورِ حاضر میں جو خرابیاں در آئی ہیں ان پر شدید تنقید بھی کی ہے۔۔۔ مجھے اس وقت اس سے قطعاً کوئی بحث نہیں ہے کہ مولانا کی یہ آراء کس حد تک صحیح ہیں اور کس حد تک غلط۔۔۔۔ یا کس حد تک واقعیت پسندی پر مبنی ہیں اور کس حد تک انتہا پسندی کی مظہر!۔۔۔۔ اس لئے کہ میری ساری گفتگو مولانا کی بیان کردہ تیسری قسم کی بیعت سے ہے جسے میں نے مزید

دو اقسام میں منقسم قرار دیا ہے۔

(۳) اب آیئے مولانا مرحوم کے ۲۸ جون ۱۹۴۲ء کے خط کی جانب تو اس میں اولاً مولانا نے پیری مریدی والی بیعت پر دوبارہ اسی انداز کی بھرپور تنقید کی ہے ـــــ اور ثانیاً اس میں بعض اصلاحات تجویز کی ہیں لیکن ان کے ضمن میں جو مثالیں دی ہیں وہ کل کی کل خلافتِ راشدہ سے متعلق ہیں۔ گویا حکومت والی بیعت کا ذکر تو موجود ہے لیکن جماعت والی بیعت کا سرے سے کوئی تذکرہ ہی نہیں کیا ـــــ ثالثاً ـــــ خلفائے راشدین کی بیعت کے ضمن میں بھی اس حقیقت اور واقع سے صرفِ نظر کرنا مناسب سمجھا ہے کہ وہاں ہر بار نئے خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت ہوتی تھی اور سابق خلیفہ کی بیعت از خود نئے خلیفہ کو منتقل نہیں ہوجاتی تھی۔ رابعاً ـــــ اس ضمن میں ہاتھ میں ہاتھ نہ لینے کے سلسلے میں خواتین کی بیعت کا ذکر کیا ہے لیکن مصافحہ کی حد تک جائے بغیر دونوں طرف سے ہاتھ بڑھانے ـــــ یا ایک برتن میں پانی ڈال کر اس میں ایک جانب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے دستِ مبارک کو ڈالنا اور دوسری جانب بیعت کرنے والی خاتون یا خواتین کے ہاتھ ڈالنے کا تذکرہ تک نہیں کیا ـــــ (حالانکہ تفہیم القرآن جلد پنجم میں سورۂ ممتحنہ کے ذیل میں یہ ساری باتیں بیان ہوئی ہیں۔)

(۴) ان دونوں خطوط کے مابین جو فرق و تفاوت ہے اس کی حقیقت تک رسائی کے لئے اس واقعہ کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اس عرصے کے دوران میں جماعت اسلامی بالفعل قائم ہوچکی تھی اور مولانا مودودی اس کے امیر قرار پاچکے تھے ـــــ لیکن اس کی روداد یا دستور میں "بیعت" کی کسی قسم کا ذکر ـــــ یا اس کی کسی اصلاح یافتہ شکل کا حوالہ تو درکنار سرے سے بیعت کا لفظ ہی کہیں استعمال نہیں ہوا ـــــ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ ـــــ راقم کا موقف یہ ہے کہ ایسا اس لئے ہوا کہ کسی سبب سے مولانا قیامِ جماعت کے وقت نظمِ جماعت کے ضمن میں اپنے اصل ذہن اور فکر کو بروئے کار نہیں لاسکے! ـــــ چنانچہ ان کی یہی ذہنی الجھن اس خلطِ مبحث کا سبب بنی ہے جو جون ۴۲ء والے خط میں نظر آرہا ہے!۔

(۵) رہا یہ سوال کہ وہ سبب کیا تھا جس کے باعث مولانا مرحوم اپنے اصل ذہن و فکر کو بروئے کار نہیں لاسکے تو اس کا جواب اس حقیقت کے حوالے سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ

مولانا ہمیشہ اس کے قائل رہے کہ جماعت اسلامی کے امیر کو ویٹو کا اختیار حاصل ہونا چاہئے۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء کے اجتماع الٰہ آباد کے موقع پر اس مسئلے پر شدید بحث ہوئی اور اس مسئلے میں مولانا امین احسن اصلاحی کی مخالفت کے باعث اس درجہ تلخی پیدا ہوگئی کہ اندیشہ ہوگیا تھا کہ یہ اکٹھ قائم نہیں رہے گا اور جماعت ختم ہوجائے گی۔ چنانچہ بعض حضرات پر (بشمول مولانا مسعود عالم ندویؒ) گریہ بھی طاری ہوگیا تھا۔۔۔ بہرحال اس وقت مولانا نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ جماعت کے ٹوٹنے کے خطرے کو مول نہ لیا جائے اور کوئی صورت مصالحت کی نکال لی جائے۔ اس لئے کہ مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا علی میاں سمیت بہت سے علماء تو جماعت سے پہلے ہی علیحدہ ہوچکے تھے اب مولانا اصلاحی اور بعض دوسرے علماء کی علیحدگی سے جماعت کی دینی حیثیت کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔۔۔ چنانچہ ایک نہایت پیچ در پیچ فارمولا وضع کیا گیا' جس کی حیثیت خالص نظری رہی اس طرح وہ بحران تو ٹل گیا لیکن چونکہ اس طرح انسان کا ذہن اور مزاج تو نہیں بدل سکتا لہٰذا مولانا کا طرز عمل مسلسل یہ رہا کہ وہ جب بھی کوئی نیا قدم اٹھانا چاہتے تھے اپنی صوابدید کے مطابق اس کا آغاز کسی جلسۂ عام سے کردیتے تھے اور بعد میں مجلسِ شوریٰ اس مخمصے میں گرفتار ہو کر رہ جاتی تھی کہ اب امیر جماعت کے اقدام سے براءت کیسے کرے!۔۔۔ تا آنکہ ۵۷۔۱۹۵۶ء کا بحران آیا اور اس موقع پر مولانا نے ماچھی گوٹھ میں منعقدہ اجتماعِ ارکان میں فرمایا کہ میری راہ کی بعض مشکلات ایسی ہیں جن کی بنا پر میں امارت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ اگر انہیں دور کردیا جائے تو البتہ میں یہ ذمہ داری سنبھال سکتا ہوں۔ اور وہ وجوہات ایسی ہیں کہ میں انہیں تمام ارکان کے سامنے نہیں رکھنا چاہتا' لہٰذا ہر حلقے سے دو دو افراد کا انتخاب عمل میں لایا جائے تاکہ میں ان کے سامنے اپنی مشکل بیان کرسکوں۔۔۔ اس اجتماعِ نمائندگان کے سامنے مولانا نے اس دستوری پیچیدگی کو بیان کیا اور دستور جماعت میں ترامیم کرالیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی ان منتخب حضرات میں شامل نہیں تھے البتہ مجلسِ شوریٰ کے رکن منتخب ہوگئے تھے چنانچہ ان کے سامنے یہ معاملہ پہلی بار کوٹ شیر سنگھ میں منعقدہ اجتماع شوریٰ میں آیا۔ چنانچہ وہ اسی وقت اٹھ کر روانہ ہوگئے اور لاہور پہنچ کر انہوں نے جماعت کی رکنیت سے استعفاء دے دیا۔۔۔ اور بعد میں جو تلخ خط و کتابت مولانا مرحوم اور مولانا اصلاحی کے مابین ہوئی اس

میں انہوں نے یہ الفاظ بھی لکھے کہ میں تو سمجھتا تھا کہ میں بلی کو مار چکا ہوں مجھے کیا معلوم تھا کہ اسے آپ نے تھیلے میں چھپا لیا تھا—— اور اب اپنے "خلوتیانِ راز" کے سامنے اسے تھیلے سے نکال باہر کیا ہے!—— کوٹ شیر سنگھ کے اجتماع میں مولانا مودودی مرحوم نے جو تقریر کی تھی اس کا لبِ لباب یہ تھا کہ جمہوریت یا شورائیت کے تقاضے حکومت اور ریاست کی سطح پر کچھ اور ہوتے ہیں اور تحریک اور جماعت کی سطح پر کچھ اور! مولانا کے ۱۹۵۰ء کے ان الفاظ کا تعلق مارچ ۱۹۴۱ء کے خط میں مستعمل الفاظ "امیر یا امام" سے جڑتا ہے—— اور یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے—— کہ مولانا کا ذہن اصلاً یہ تھا کہ جماعت اسلامی کے امیر کے پاس ویٹو کا حق ہونا چاہئے—— اور اس کے ساتھیوں کو اس سے "سمع و طاعت فی المعروف" کے تعلق میں منسلک ہونا چاہئے—— اور مشورہ و مشاورت کو اصلاً ساتھیوں کا "حق" نہیں بلکہ امیر کی ضرورت اور ساتھیوں کا "فرض" قرار دینا چاہئے—— البتہ معروف کے دائرے کے اندر اندر کسی بھی مشورے کو قبول یا رد کر دینے کا اختیار امیر کے پاس ہونا چاہئے۔

میں اس موقف کو نہ صرف کتاب و سنت کے نصوص اور امت کے مسلسل تعامل بلکہ اقامتِ دین کی انقلابی جدوجہد کے تنظیمی تقاضوں کی مصلحتوں کے اعتبار سے بھی صد فی صد درست سمجھتا ہوں—— اور اس کا اعلان بھی میں نے تحریری صورت میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی تاسیس کے موقع پر جولائی ۱۹۷۲ء میں کر دیا تھا—— دس سال بعد ۸۲ء میں جب مولانا کا مارچ ۴۱ء والا خط پڑھنے میں آیا تو اس سے راقم کو یقین ہو گیا کہ مولانا مرحوم کا ذہن بھی یہی تھا جسے وہ اپنے بعض بااثر ساتھیوں کی مخالفت کی بنا پر پورے طور پر بروئے کار نہ لا سکے۔ بہرحال کسی کو اس اندازِ فکر سے اتفاق ہو یا اختلاف—— ہمارا اخلاقی فرض یہ ہے کہ حقائق و واقعات کو ان کے اصل تناظر میں رکھ کر ان کا حتی الامکان معروضی مطالعہ کریں—— اور کسی کو بھلا لگے یا برا' جو حقائق بھی سامنے آئیں ان کے علی الاعلان اظہار سے دریغ نہ کریں——

لاہور: ۲ر مارچ ۸۶ء

فقط والسلام
خاکسار—— اسرار احمد عفی عنہ

(نوٹ: افسوس کہ تکبیر نے راقم کی یہ وضاحت پوری شائع نہیں کی۔ بلکہ اس کا صرف خلاصہ شائع کیا۔)

پریس ریلیز

(۱)

اسلام کے خلاف سیکولر اور نیم سیکولر قوتوں کا اتحاد

لاہور۔ ۱۵؍ جنوری: ڈاکٹر اسرار احمد امیر تنظیم اسلامی پاکستان نے کہا ہے کہ قومی اسمبلی کی امور خارجہ سے متعلق کمیٹی کی چیئرپرسن کے طور پر بے نظیر بھٹو کا متفقہ انتخاب کوئی لطیفہ غیبی نہیں بلکہ مفاہمت کی طرف یہ قدم امریکہ کے اشارے پر اٹھایا گیا ہے جو یہاں اسلام کے خلاف سیکولر اور نیم سیکولر قوتوں کو جمع کر دینا چاہتا ہے۔ مسجد دارالسلام باغ جناح میں جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے یاد دلایا کہ کچھ ہی دنوں پہلے ان کی طرف سے تازہ عام انتخابات کا مطالبہ کیا گیا تھا کیونکہ ملک میں لادینی طبقات اپنی قوت جمع کر رہے ہیں اور اس مقصد میں ان کی کامیابی سے پہلے پہلے اگر ایک اور الیکشن ہو جائے تو دینی عناصر کے لئے اسلام کے نام پر کوئی نہ کوئی کردار ادا کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اس غرض کے لئے بھی پاکستان کے دینی عناصر کو دو واضح طور پر الگ محاذوں پر جمع ہونا ہوگا۔ ایک محاذ ان دینی مذہبی جماعتوں کا ہونا چاہئے جو تاحال اس خیال پر قائم ہیں کہ انتخابی سیاست کے ذریعے بھی یہاں اسلام کی کوئی خدمت کی جاسکتی ہے اور دوسرا محاذ اسلامی انقلاب کے ان علمبردار طبقات کا ہو جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ نفاذ اسلام کے لئے موجودہ نظام زندگی میں جس بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے وہ صرف مزاحمتی تحریک کے ذریعے لائی جاسکتی ہے۔

قبل ازیں امیر تنظیم اسلامی نے کشمیر اور بوسنیا میں مسلمانوں کی نسل کشی، عراق پر تازہ ترین امریکی جارحیت اور بمبئی میں مسلمانوں کے قتل عام اور ان کی املاک کے بے دریغ نذر آتش کئے جانے کی اندوہناک تفصیلات کا ذکر کیا اور کہا کہ مصائب و آلام زندگی کا حصہ ہیں اور سبھی انسانوں کا ان سے واسطہ پڑتا ہے لیکن مسلمانوں کو عام حالات میں بھی انہیں اسی آزمائش کا حصہ سمجھنا چاہئے جس میں سے گزرنے کے لئے انہیں زندگی کی مہلت دی گئی، تاہم موجودہ صورت حال مسلمانوں کے لئے عذاب الٰہی کی ایک شکل ہے جس کا مقصد ان کو خبردار کرنا اور ان کے کرتوتوں کی سزا دینا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ سارے عذاب مسلمانوں ہی کے لئے کیوں رہ گئے ہیں جبکہ غیر مسلم اقوام اللہ تعالیٰ کی کھلی کھلی نافرمانی کے باوجود عیش و راحت میں ہیں اور دنیا پر حکومت کر رہی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اس سوال کا جواب بہت سادہ ہے بشرطیکہ ہم صرف اتنی سی بات سمجھ لیں کہ ختم نبوت کے بعد مسلمان

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت اجابت ہیں اور پوری دنیا کے باقی انسان آپؐ کی امت دعوت ہیں جن تک دین پہنچانا ہم مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ ان پر اتمام حجت نہیں کی گئی لہٰذا کم از کم اس دنیا میں وہ بری الذمہ ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ اب چونکہ رسولوں کی آمد بند ہو چکی ہے لہٰذا پوری امت پر بحیثیت مجموعی عذاب استیصال تو قیامت تک نہیں آئے گا لیکن جزوی طور پر۔ اور بعض علاقوں میں ایسا ہونا ممکن ہے کہ عذاب الٰہی کے نتیجے میں مکان تو کھڑے نظر آئیں لیکن مکینوں کا نشان تک مٹ جائے جس کی ایک مثال ہسپانیہ سے مسلمانوں کی جڑ کٹ جانے کی شکل میں رونما ہو چکی ہے۔ انہوں نے کہا کہ آج مسلمان جس عذاب کی گرفت میں ہیں، وہ صرف انہی کا مقدر ہے اور غیر مسلم اقوام اس سے محفوظ رہیں گی کیونکہ ہم نے اللہ کا پیغام ان تک پہنچایا ہی نہیں۔ بحالات موجودہ تو ہماری اپنی بد عملی کے بوجھ کے علاوہ دنیا کے باقی انسانوں کے کفر و ضلالت کا بار بھی ہمارے سر پر ہے جس سے بچنے کی واحد صورت اللہ کی جناب میں توبہ اور اپنے اس فرض منصبی کی ادائیگی ہے جو حضورؐ کی امت اجابت ہونے کے سبب ہم پر عائد ہوتا ہے۔○○

------(۲)------

بابری مسجد کی شہادت اور ہندومت کا احیاء

لاہور۔ ۸ر جنوری: امیر تنظیم اسلامی پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ بھارت میں ہندو بنیاد پرستی کا اصل ہدف پاکستان ہے ورنہ ہندوستانی مسلمان تو پہلے ہی ان کے پاس یرغمال ہیں جن کی قیمت پر ہم نے یہاں عیش و آرام کے ایوان سجائے ہیں لہٰذا اصل سزا بھی ہمیں ملے گی۔ وہ مسجد دارالسلام باغ جناح میں جمعہ کے اجتماع سے خطاب کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ بابری مسجد کی شہادت ہندومت کے احیاء کی تحریک کے عروج کی علامت ہے جس نے بھارتی سیکولرزم کو آخری شکست دی اور خود کانگریس کو بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے خبردار کیا کہ بھارت کا کٹر ہندو اب افغانستان سے انڈونیشیا تک پراچین بھارت کے قیام کا خواب دیکھ رہا ہے جس کی راہ میں پاکستان نام کی ایک ہی رکاوٹ ہے ورنہ اس پورے خطے میں اس کی بالادستی کو اور کون چیلنج کر سکتا ہے۔ انہوں نے افسوس کا اظہار کیا کہ پاکستان کے مسلمانوں نے اپنے ملک میں اسلام کے نظام عدل اجتماعی کی عملداری سے مجرمانہ اغماض برت کر نہ صرف اقبال اور قائداعظم کے مشن سے غداری کی بلکہ ہندوستان میں اکثریت کے رحم و کرم پر رہ جانے والے مسلمانوں کے نہ ختم ہونے والے مصائب کا بار بھی

اپنی گردن پر لے لیا ہے جو سقوط ڈھاکہ کے بعد سے پاکستان کے جذباتی سہارے سے بھی محروم ہوگئے ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ بھارتیوں کے وفود اس تحقیق کے لئے سپین تک جاتے رہے ہیں کہ اس خطہ ارض سے مسلمانوں کا نام و نشان کیسے مٹایا گیا کیونکہ یہی مہم انہیں بھی درپیش ہے ۔ اسرائیل سے بھارت کا گٹھ جوڑ پہلے ڈھکا چھپا تھا' اب پوری طرح کھل کر سامنے آگیا ہے جس میں اشتراک عمل کی بنیاد اسلام اور مسلمانوں سے عداوت ہے ۔ امیر تنظیم اسلامی نے اندیشہ ظاہر کیا کہ بابری مسجد کی شہادت ایک فیلر ثابت ہوسکتی ہے جس کے بعد یہی حشر مسجد اقصیٰ کا ہونے والا ہے کیونکہ صیہونیوں نے بھی دیکھ لیا کہ بابری مسجد کے سانحے پر مسلمانوں کی کسی ایک حکومت نے بھی بھارت کو سفارتی تعلقات توڑنے تک کی دھمکی نہیں دی۔ انہوں نے کہا کہ خود ہمارے حالات تیزی سے بگڑ رہے ہیں ۔ ہم پل صراط پر سے گزر رہے ہیں۔ عذاب کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ تاہم ابھی ہمارے پاس ایک موقع موجود ہے کہ قوم یونس کی طرح آخری وقت میں ہی توبہ کرلیں ۔ جس اجتماعی توبہ سے یہ عذاب ٹل سکتا ہے اس کے تقاضے بتاتے ہوئے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ ہمیں کتاب ہدایت کی طرف رجوع کرنا اور رہنمائی کے حصول کے لئے صبر اور یقین کے ساتھ قرآن مجید کے پڑھنے پڑھانے کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانا ہوگا اور اس کے ساتھ پورے کے پورے دین کو قائم کرنا ہوگا جسے اقامت دین کا کام کرنے والے پہلے اپنی زندگیوں پر نافذ کریں۔

شناختی کارڈ پر مذہب کے اندراج کے معاملے میں حکومت کی قلابازیوں کی مذمت کرتے ہوئے امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ آئی جے آئی کی حکومت کی طرف سے یہ طرز عمل حد سے زیادہ شرمناک اور پرلے درجے کی ڈھٹائی ہے اور اس معاملے پر پسپائی سیکولرزم کی منزل کی جانب ایک اہم سنگ میل ثابت ہوگی ۔ انہوں نے کہا کہ اپنا مذہب چھپانا محض قادیانیوں کا مسئلہ ہے ورنہ عیسائی تو دھڑلے سے اپنے مذہب کا اعلان کرتے ہیں جن کی شناخت اگر شناختی کارڈ پر ہو تو ان کا اس میں کوئی نقصان نہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ عیسائی اقلیت کو مٹھی بھر مرزائیوں نے بڑی عیاری سے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے۔ ○○

بقیہ: عرضِ احوال

بھی سوویت یونین کی طرح دنیا کے نقشے سے حرفِ غلط کی طرح مٹ کر رہ جائے۔ اس لئے کہ ایک جانب بھارت کا کٹر ہندو اصلاً افغانستان سے انڈونیشیا تک کے پراچین بھارت کے احیاء کا خواب دیکھ رہا ہے' اور اس راہ کا واحد کانٹا اس کے نزدیک صرف پاکستان ہے۔ اور دوسری جانب ع "جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے!" کے مصداق ہمارا روائتی محافظ اور سرپرست امریکہ بھی اب ہمیں بالکل بے دست و پا کر کے (بلکہ باضابطہ ہاتھ پاؤں باندھ کر) بھارت کے آگے ڈالنے کا فیصلہ کرچکا ہے۔ چنانچہ ادھر وہ ہمارے ایٹمی پروگرام کو منجمد تو کرا ہی چکا ہے' رول بیک کرنے پر بھی مجبور کررہا ہے۔ (اور کیا عجب کہ کرا بھی چکا ہو!) اور ادھر افغانستان کی حد تک تو اپنی ترجیحات پر عمل کرا ہی چکا ہے' پاکستان کا نام دہشت گرد ملکوں کی فہرست میں درج کردینے کی دھمکی کے تحت ہزاروں کشمیری مسلمانوں کے خون سے غداری پر بھی مجبور کررہا ہے!---- الغرض معاملہ صرف بھارت میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کا نہیں' خود پاکستان کے وجود اور بقاء اور پورے جنوبی ایشیا میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کا ہے! لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ سطح بینی سے گریز کرتے ہوئے حقائق کو پوری گہرائی میں اتر کر دیکھا اور سمجھا جائے۔

رہا یہ سوال کہ پاکستان مستحکم کیوں نہ ہوسکا تو اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ فطرت کا اصول ہے کہ جو شے اپنے اصل مقصد کو گم کردے اولاً غیر اہم اور ناقابل اعتناء اور بالآخر نسیاً منسیاً ہوجاتی ہے۔ مصورِ پاکستان (حکیم الملت علامہ محمد اقبال) اور معمارِ پاکستان (قائد اعظم محمد علی جناح) دونوں کے نزدیک پاکستان کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ یہاں اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کو قائم کر کے عہدِ حاضر میں اسلام کے اصولِ حریت و اخوت و مساوات کا ایک عملی نمونہ پیش کیا جائے۔ لیکن عملاً ہوا یہ کہ یہاں نہ صرف جاگیرداری اور غیر حاضر زمینداری کا فرسودہ اور ظالمانہ نظام جوں کا توں قائم رہا بلکہ اس پر مستزاد سرمایہ داری اور سودی معیشت کی لعنت دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی چلی گئی---- نتیجۃً ایک جانب ملکی سیاست جاگیرداروں اور کچھ نودولتیے سرمایہ داروں کی تفریحِ طبع کا کھیل اور جنگ زرگری کا میدان بن کر رہ گئی۔ دوسری جانب معیشت میں لوٹ

کھسوٹ کا بازار گرم ہوا اور کروڑوں کے غبن اور اربوں کے سیکنڈلز روزانہ کا معمول بن گئے۔ اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ سورۂ توبہ کی آیات ۷۵ تا ۷۷ کے مطابق اللہ تعالیٰ سے بدعہدی کی سزا کے طور پر نفاق کا روگ دلوں میں پیدا ہو گیا۔ جس کا ایک مظہر تو حدیث نبویؐ کے مطابق یہ ہے کہ صداقت' امانت' شرافت اور ایفاءِ عہد کا دیوالہ نکل چکا ہے اور دوسرا مظہر یہ ہے کہ قومی وحدت کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ اس لئے کہ علامہ اقبال کے یہ اشعار کہ ؎ "اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر۔ خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی!" اور "ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار۔ قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری!" کسی اور مسلمان قوم یا ملک کے بارے میں صحیح ہوں یا نہ ہوں کم از کم پاکستان کے بارے میں صد فی صد صحیح ہیں۔..."

"... اس پوری صورتِ حال کی ذمہ داری ظاہر ہے کہ ہم مسلمانانِ پاکستان ہی پر عائد ہوتی ہے۔ بھارت کے مسلمان تو سرزمینِ پاکستان کو اسلام کا گہوارہ بنانے کے ضمن میں اپنے حصے کا "فرض کفایہ" ۱۹۴۷ء ہی میں ادا کر چکے تھے جس کی سزا انہیں ہندو غنڈوں کے ہاتھوں "خوف' بھوک اور جان و مال و ثمرات کے ضیاع" (البقرہ: ۱۵۵) کی صورت میں مسلسل بھگتنی پڑ رہی ہے۔ پاکستان کو بالفعل اسلام کا گہوارہ بنانے کی ذمہ داری تو ظاہر ہے کہ ہم ہی پر عائد ہوتی تھی۔ اگر ہم اس ذمہ داری کو پورا کرتے تو نہ صرف یہ کہ خود خوشحال اور مستحکم و مضبوط ہوتے بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی بھی عزت و حفاظت کی ضمانت بن جاتے۔ اس کے برعکس جب ہم نے قیامِ پاکستان کے مقصد سے بے وفائی اور غداری کی تو نہ صرف یہ کہ اکیس سال قبل خود بھی دو لخت ہوئے اور نہایت ذلت آمیز شکست سے دوچار ہوئے بلکہ اب بھارت میں مسلمانوں پر ہونے والے بہیمانہ مظالم اور اسلامی شعائر پر ہونے والے شرمناک حملوں کو بھی "تک تک دیدم' دم نہ کشیدم" کے انداز میں برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔ تاہم ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اگر موجودہ صورتِ حال میں جلد بنیادی تبدیلی پیدا نہ ہوئی اور یہاں ایک عوامی اسلامی انقلاب نہ آیا تو جو آگ آج بھارتی مسلمانوں کے خرمن کو جلا کر راکھ کر رہی ہے وہ ع "حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!" کے مصداق جلد ہی پاکستان کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔"

"چہرے کا پردہ اور اسلام"

ایک مغالطہ آمیز انٹرویو کے بارے میں ایک استفسار اور اس کا جواب

—— حافظ خالد محمود خضر ——

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی و محترمی مدیر میثاق

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

نومبر ۹۲ء کے قومی ڈائجسٹ میں "چہرے کا پردہ اور اسلام" کے زیر عنوان ایک صاحب کا انٹرویو شائع ہوا ہے' جنہیں انٹرویو نگار نے "ممتاز دینی سکالر" اور "مشرق اور مغرب کا حسین امتزاج" قرار دیا ہے۔ اس انٹرویو کی روشنی میں آپ کی خدمت میں مندرجہ ذیل سوالات پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ "میثاق" کی کسی قریبی اشاعت میں ان کا تشفی بخش جواب مرحمت فرمائیں گے۔

(۱) کیا یہ بات درست ہے کہ چہرے کا پردہ قرآن و سنت سے ثابت نہیں اور یہ ہمارے ہاں ہندو معاشرے کے زیر اثر رائج ہو گیا ہے؟

(۲) سورۃ الاحزاب میں اہلِ ایمان کو جو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ازواجِ مطہرات سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگیں' کیا واقعی یہ حکمِ حجاب صرف ازواجِ مطہرات کے لئے مخصوص ہے اور عام مومنات پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا؟

(۳) قرآن نے حجاب کی علّت کیا بیان کی ہے؟ کیا ہمارے علمائے کرام اور فقہائے عظام اسے محض ردِّ فتنہ کے اصول کی بناء پر لازم قرار دیتے ہیں؟

والسلام

عبدالرحمٰن

زیر نظر انٹرویو میں ایک خالص دینی مسئلہ کو جس طرح طنز و استہزاء اور طعن و تشنیع کا ہدف بنایا گیا ہے یہ "مشرق اور مغرب کے حسین امتزاج" ہی کا شاخسانہ ہے۔ ہمارے مغربی تہذیب و تمدن سے مرعوب دانشور اور سکالرز کا المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دینی معاملات میں معذرت خواہانہ رویّہ اختیار کرنے پر مجبور پاتے ہیں' چنانچہ وہ دین کے مسلّمہ تصورات کو مسخ کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ یہ انٹرویو جن "ممتاز دینی سکالر" کا ہے وہ قبل ازیں دین کے متعدد مسلّمہ مسائل کو اپنا تختۂ مشق بنا چکے ہیں' مثلاً مرتد کی سزا' شادی شدہ زانی کے لئے رجم کی حد' عورت کی دیت و شہادت وغیرہ۔ مزید برآں "اقامتِ دین" کا قرآنی تصور ان کے ناوک ہائے تقریر و تحریر کا خاص طور پر ہدف ہے۔ زیر نظر انٹرویو میں انہوں نے پردہ جیسے اسلامی شعار کو نہ صرف متنازعہ بنانے' بلکہ اسے ہندو معاشرے کا ایک پرتو قرار دینے کی جو کوشش کی ہے وہ انتہائی قابلِ مذمت ہے۔

چہرے کا پردہ ایک قرآنی حکم ہے جو سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۹ میں بایں الفاظ مذکور ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَاۗءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ط

قرآن حکیم کے معروف اردو تراجم میں اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے:

۱۔ ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ:

"اے نبی کہہ دے اپنی عورتوں کو اور اپنی بیٹیوں کو اور مسلمانوں کی عورتوں کو نیچے لٹکالیں اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں۔"

۲۔ ترجمہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم:

"اے نبی' اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہلِ ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں۔"

۳۔ ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی:

"اے نبی! اپنی بیویوں' اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو ہدایت کردو کہ وہ اپنے اوپر اپنی بڑی چادروں کے گھونگٹ لٹکا لیا کریں۔"

آیت مذکورہ میں "یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ" کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔۔۔ "یُدْنِیْنَ" کا مصدر "اِدناء" ہے جس کے اصل معنی قریب کرنے اور لپیٹ لینے کے ہیں' مگر جب اس کے ساتھ "عَلٰی" کا صلہ آئے تو اس میں "اِرخاء" کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے' یعنی اوپر سے لٹکالینا۔ جَلَابِیب' جِلباب کی جمع ہے جو عربی میں بڑی چادر کو کہا جاتا ہے۔ اس چادر کی ہیئت کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ وہ چادر ہے جو دوپٹہ کے اوپر اوڑھی جاتی ہے[۱] حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ جلباب اس لمبی چادر کو کہتے ہیں جس میں عورت سر سے پیر تک مستور ہو جائے[۲] آیت مذکورہ میں اس کے ساتھ "مِن" کا حرف آیا ہے جو یہاں تبعیضیہ ہے' یعنی چادر کا ایک حصہ یا پلو۔ اب آیت کا صاف اور سیدھا مفہوم یہی بنتا ہے کہ مسلمان عورتیں جب کسی ضرورت سے گھروں سے باہر نکلیں تو اپنی بڑی چادریں اچھی طرح اوڑھ لپیٹ لیا کریں اور ان کا ایک حصہ یا پلو اپنے اوپر لٹکا لیا کریں' جسے عرف عام میں گھونگھٹ نکالنا یا گھونگھٹ ڈالنا کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے آیت کا ترجمہ ہی یہ کیا ہے "کہ وہ اوپر اپنی بڑی چادروں کے گھونگھٹ لٹکالیا کریں"۔ مولانا کے اس ترجمہ میں ان کے تلمیذ خاص ہونے کے دعویدار "ممتاز دینی سکالر" کے لئے عبرت اور رہنمائی کا بہت سا سامان موجود ہے۔

عہدِ رسالت کے قریب ترین زمانے سے لے کر عہدِ حاضر تک کے تمام جلیل القدر مفسرین نے اس کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ چنانچہ ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے جلباب کے استعمال کی صورت یہ نقل کی ہے کہ عورت سر سے پاؤں تک اس میں لپٹی ہوئی ہو اور چہرہ اور ناک بھی اس سے مستور ہو' صرف ایک آنکھ راستہ دیکھنے کے لئے کھلی ہو[۳] ابن جریر اور ابن المنذر کی روایت ہے کہ محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبیدۃ السلمانیؒ سے اس آیت کا مطلب اور جلباب کی کیفیت دریافت کی تو انہوں نے اپنی چادر اٹھائی اور اسے اس طرح اوڑھا کہ پورا سر اور پیشانی اور پورا منہ ڈھانک کر صرف بائیں آنکھ کھلی رکھی[۴] اس طرح آپؒ نے اِدناءِ جلباب کی تفسیر عملاً بیان فرمائی۔ (حضرت عبیدہ سلمانیؒ جلیل القدر تابعی ہیں' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمان ہو چکے تھے مگر حاضرِ خدمت نہ ہو سکے تھے' حضرت عمر

رضی اللہ عنہ کے دور میں مدینہ آئے اور وہیں اقامت پذیر ہو گئے۔ آپؒ کو فقہ اور قضا میں قاضی شُرَیح کا ہم پلہ مانا جاتا تھا[۵]) اسی طرح سدیؒ، قتادہؒ اور دیگر تابعینؒ سے بھی اس آیت کا یہی مفہوم منقول ہے۔

صحابہؓ و تابعینؒ کے زمانے کے بعد کے اکابر مفسرین نے بھی اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔ علامہ ابوبکر جصاصؒ کہتے ہیں:

فی هٰذِه الآیة دلالةٌ علیٰ انّ المرأةَ الشّابةَ مامورةٌ بسترِ وجهِهَا عَن الاَجنبیّن و اظهارِ السّترِ وَالعفافِ عندالخُروج[۶]

(یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جوان عورتوں کو اجنبیوں سے اپنا چہرہ چھپانے کا حکم ہے اور باہر نکلتے وقت انہیں ستر اور عفت مآبی کا اظہار کرنا چاہئے)

امام ابن جریر طبری نے بھی اسی آیت کے تحت چہرے اور سر کے بالوں کے ڈھانپنے کا حکم بیان کیا ہے[۷] ابوبکر محمد بن عبداللہ (ابن عربی) نے **یُدنِین علیهِنّ** کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کیا ہے: **تغطّی به وجهَها حتی لایظهر منها الاعینها الیسریٰ**[۸] یعنی عورت چادر سے اپنا چہرہ اس طرح ڈھانپ لے کہ صرف بائیں آنکھ کھلی رہے۔ علامہ زمخشری **یدنین علیهن** کی تفسیر میں لکھتے ہیں: **یرخینها علیهنّ ویغطّین بها وجوههنّ و اعطافهن**[۹] یعنی وہ اپنے اوپر اپنی چادروں کا ایک حصہ لٹکا لیا کریں اور ان سے اپنے چہرے اور اپنے اطراف کو اچھی طرح ڈھانک لیں۔ مزید برآں امام فخرالدین رازی، علامہ محمود نسفی اور علامہ نظام الدین نیشاپوری نے بھی اپنی اپنی تفاسیر میں اسی آیت کے تحت چہرے کے پردے کو لازم قرار دیا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں چند اردو تفاسیر کے حوالے بھی ملاحظہ کر لئے جائیں۔

(۱) شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ تفسیر عثمانی میں لکھتے ہیں:

"یعنی بدن ڈھانپنے کے ساتھ چادر کا کچھ حصہ سر سے نیچے چہرہ پر بھی لٹکا لیویں۔ روایات میں ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے پر مسلمان عورتیں بدن اور چہرہ چھپا کر اس طرح نکلتی تھیں کہ صرف ایک آنکھ دیکھنے کے لئے کھلی رہتی تھی[۱۰]"

(۲) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ تفسیر بیان القرآن میں رقمطراز ہیں:

"اے پیغمبر' اپنی بیبیوں سے اور اپنی صاحبزادیوں سے اور دوسرے مسلمانوں کی بیبیوں سے کہہ دیجئے کہ (سر سے) نیچی کرلیا کریں اپنے (چہرے کے) اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں' اس سے جلدی پہچان ہوجایا کرے گی تو آزار نہ دی جایا کرینگی (یعنی کسی ضرورت سے باہر نکلنا پڑے تو چادر سے سر اور چہرہ بھی چھپالیا جاوے[11]......)"

(۳) مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ؒ نے تفسیر معارف القرآن میں تحریر فرمایا ہے:

"اس آیت کی پوری تفسیر آگے آتی ہے' یہاں صرف یہ بتلانا منظور ہے کہ ضرورت کے وقت جب عورت گھر سے نکلنے پر مجبور ہو تو اس کو پردہ کا یہ درجہ اختیار کرنا ضروری ہے کہ جلباب وغیرہ میں سر سے پاؤں تک مستور ہو اور چہرہ بھی بجز ایک آنکھ کے چھپا ہوا ہو[12]"

(۴) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے تفہیم القرآن میں اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

"اللہ تعالیٰ صرف چادر لپیٹ کر زینت چھپانے ہی کا حکم نہیں دے رہا بلکہ یہ بھی فرما رہا ہے کہ عورتیں چادر کا ایک حصہ اپنے اوپر سے لٹکا لیا کریں۔ کوئی معقول آدمی اس ارشاد کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں لے سکتا کہ اس سے مقصود گھونگھٹ ڈالنا ہے تاکہ جسم و لباس کی زینت چھپنے کے ساتھ ساتھ چہرہ بھی چھپ جائے[13]"

(۵) مولانا امین احسن اصلاحی صاحب تفسیر تدبر قرآن میں اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"یہاں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اپنی بڑی چادروں (جلابیب) کا کچھ حصہ اپنے اوپر لٹکا لیا کریں۔ اس کو اپنے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان بڑی چادروں سے گھونگھٹ نکال لیا کریں" ...."قرآن نے اس جلباب سے متعلق یہ ہدایت فرمائی کہ مسلمان خواتین گھروں سے باہر نکلیں تو اس کا

> کچھ حصہ اپنے اوپر لٹکا لیا کریں تاکہ چہرہ بھی فی الجملہ ڈھک جائے اور انہیں چلنے پھرنے میں بھی زحمت پیش نہ آئے۔ یہی 'جلباب' ہے جو ہمارے دیہاتوں کی شریف بڑی بوڑھیوں میں اب بھی رائج ہے اور اسی نے فیشن کی ترقی سے اب برقع کی شکل اختیار کرلی ہے"۔

علامہ حمید الدین فراہیؒ کو نظم قرآن کے فہم میں خصوصی مقام حاصل تھا۔ انہوں نے حجاب کے بارے میں اپنے ایک مکتوب میں ہاتھ اور چہرہ کھلا رکھنے کو جائز قرار دینے کے موقف کے بارے میں لکھا ہے کہ "میری رائے میں نظم قرآن پر توجہ نہ کرنے سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے"۔ مزید لکھتے ہیں: "صحابہؓ اور تابعینؒ زیادہ واقف تھے' انہوں نے ٹھیک سمجھا ہے' مگر متاخرین حضرات نے ان کا کلام بھی نہیں سمجھا۔ بہرحال **اَلحقُّ احقُّ بِاَن یُّتَّبَعَ** میں اس مسئلہ پر مطمئن ہوں اور میرے نزدیک اجنبی سے پورا پردہ کرنا واجب ہے' اور قرآن نے یہی حجاب واجب کیا ہے جو شرفاء میں مروّج ہے بلکہ اس سے قدرے زائد"۔ (مولانا فراہیؒ کا یہ مکتوب ماہنامہ حیات نو بلریا گنج انڈیا کے اکتوبر ۹۲ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔)

تو یہ ہے پردے کا وہ تصور جو نصِّ قرآنی سے ثابت ہے' جس پر زمانۂ نبوت اور دورِ صحابہؓ و تابعینؒ سے امّت کا تعامل ہے اور جس پر اکابر مفسرینِ قرآن متفق ہیں۔ اس سب کے باوجود اگر آج کوئی شخص اٹھ کر یہ کہتا ہے کہ پردہ کا یہ تصور محض مولویوں کا ایجاد کردہ ہے تو اس کے لئے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے جو الفاظ ارشاد فرمائے ہیں ان کو نقل کرنا غیر مناسب نہ ہوگا۔ اصلاحی صاحب اپنی تصنیف "اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام" میں لکھتے ہیں:

> "پردہ سے متعلق تمام اصولی ہدایات خود قرآن مجید میں وارد ہیں اور ان کی ضروری توضیحات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہیں۔ اس وجہ سے پردہ کو محض مولویوں کی ایجاد قرار دینا یا تو بدترین قسم کی جہالت ہے یا بدترین قسم کی منافقانہ جسارت" (ص ۱۱۱)

اور اس سے آگے بڑھ کر کوئی شخص یہ کہنا شروع کردے کہ پردہ کا یہ تصور یہاں ہندو معاشرے کے زیر اثر رائج ہوگیا ہے تو ع ناطقہ سربگریباں ہے اسے کیا کہئے!

اگر چہرے کے پردے کا رواج صرف برِّعظیم پاک وہند ہی کے اندر ہوتا تو اِس بات میں کچھ وزن محسوس کیا جا سکتا تھا ـــــ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ پردہ پورے عالمِ اسلام میں صدیوں سے رائج رہا ہے۔ علامہ ابوالحیان اندلس میں مسلمان خواتین کے پردے کی کیفیت بایں الفاظ بیان کرتے ہیں :**و کذا عادۃ بلاد اندلس لا یظھر من المرأۃ اِلّا عینھا الواحدۃ** (۱۵) یعنی بلادِ اندلس میں مسلمان خواتین اس طرح پردہ کرتی ہیں کہ ایک آنکھ کے سوا ان کے جسم کا کوئی حصہ کھلا نہیں ہوتا۔ پھر عرب کی بدو عورتیں آج بھی جس طرح اپنے آپ کو جلباب میں پوری طرح لپیٹ کر صرف ایک آنکھ کھلی رکھتی ہیں تو کیا وہاں بھی یہ پردہ ہندوانہ معاشرت کے اثر سے رواج پا گیا تھا؟ **فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَارِ!!**

سطورِ بالا میں اس سلسلہ کے پہلے سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ بقیہ سوالات کے جوابات ان شاء اللہ العزیز اگلے شمارے میں شاملِ اشاعت کئے جائیں گے۔

حواشی

۱۔ معارف القرآن، ج ۷، ص ۲۳۳
۲-۳۔ معارف القرآن، ج ۷، ص ۲۱۷
۴۔ روح المعانی، ج ۲۲، ص ۸۹
۵۔ تفہیم القرآن، ج ۴، ص ۱۲۹
۶۔ احکام القرآن للجصاص، ج ۳، ص ۳۷۲
۷۔ جامع البیان، ج ۲۲، ص ۳۳
۸۔ احکام القرآن لابن عربی، ج ۳، ص ۱۵۷۴
۹۔ الکشاف، ج ۲، ص ۲۲۱
۱۰۔ تفسیر عثمانی مطبوعہ تاج کمپنی، ص ۵۶۸
۱۱۔ تفسیر بیان القرآن، ج ۸، ص ۶۵
۱۲۔ معارف القرآن، ج ۷، ص ۲۱۷
۱۳۔ تفہیم القرآن، ج ۴، ص ۱۳۱
۱۴۔ تدبر قرآن، ج ۶، ص ۲۶۹
۱۵۔ تفسیر ضیاء القرآن، ج ۴، ص ۹۵

رپورتاژ

تنظیمِ اسلامی پاکستان کے ذمہ دار حضرات کے لیے
کراچی میں چھ روزہ خصوصی تربیت گاہ

کوئی بھی اجتماعیت افراد سے بنتی ہے۔ افراد کی سعی و جہد ہی اجتماعیت کو پروان چڑھاتی ہے۔ تنظیم اسلامی ان بامقصد افراد کے مجموعے کا نام ہے جن کا مقصدِ حیات اللہ کی رضا کے حصول کی خاطر اس کے دین کے قیام اور بالادستی کے لئے تن من دھن سے بھرپور کوشش کرنا ہے۔ تنظیمِ اسلامی اپنے شریک قافلہ ساتھیوں کی نظریاتی تربیت کے لئے گاہ بگاہ تربیت گاہوں کا انعقاد کرتی ہے۔ سال ۱۹۹۲ء کا اختتام بھی ایک چھ روزہ تربیت گاہ پر ہوا۔ یہ مبارک تربیت گاہ تنظیم کے ان افراد کے لئے تھی جو کسی نہ کسی ذمہ داری پر فائز ہیں۔ چنانچہ تمام امراء، ناظمین اور نقباء اس تربیت گاہ میں شریک ہوئے۔ اس کی ضرورت اس لئے بھی محسوس کی گئی کہ یہی وہ لوگ ہیں جو تنظیم کی گاڑی کے اہم پہیے ہیں۔ یہ جس قدر فعال ہونگے اسی قدر تنظیم کی رفتار تیز ہوگی، اپنے مقصد اور طریقہ کار پر انہیں جس قدر انشراح ہوگا اسی قدر وہ لگن کے ساتھ اپنی توانائیاں اس کی خاطر کھپا سکیں گے۔ یہ تربیت گاہ جسے ہم ریفریشر کورس کا نام بھی دیتے ہیں، قرآن اکیڈمی کراچی میں ۲۵ دسمبر ۹۲ء سے ۳۰ دسمبر ۹۲ء تک جاری رہی۔

تربیت گاہ کے انعقاد سے دو یوم قبل امیرِ تنظیم کراچی پہنچے۔ آپ کا قیام ناظمِ حلقہ سندھ و بلوچستان جناب نسیم الدین صاحب کے یہاں رہا۔ ان کے مکان پر آپ نے کراچی کے دو دانشور حضرات سے ملاقات کی، جس کا وقت پہلے طے ہوچکا تھا۔ صبح دس بجے آپ حلقہ کے دفتر آرام باغ تشریف لے آئے، یہاں بھی ملاقاتیں رہیں۔ شام ۴ بجے تنظیمِ اسلامی شرقی نمبر ا گلشن اقبال کے دفتر میں خواتین کے اجتماع سے خطاب کیا۔ یہ خواتین کے سہ روزہ اجتماع کا تیسرا اور آخری دن تھا، جس میں خواتین صبح دس بجے جمع ہوجاتیں اور شام ۵ بجے اپنے گھروں کو چلی جاتیں۔ اس اجتماع میں خواتین کی تعداد پچاس کے لگ بھگ رہی۔ خواتین نے اس میں بڑے ذوق و شوق سے شرکت کی، اپنا کھانا ساتھ لے کر آتی رہیں البتہ چائے کا انتظام دفتر ہی میں ہوتا رہا۔

قرآن اکیڈمی کراچی میں امیرِ محترم کے خطابِ جمعہ کے لئے اخبارات میں اشتہار دیا جاچکا تھا جس کا موضوع "بابری مسجد کا سانحہ اور امتِ مسلمہ کا مستقبل" تھا۔ شہر کے مختلف علاقوں سے چار بسیں چلائی گئیں تھیں جن کے متعین راستے اور وقت کی اطلاع بذریعہ اخبار دے دی

گئی تھی۔ امیر تنظیم اسلامی اپنی بات قرآن مجید ہی کے حوالے سے کرتے ہیں اور ان کی سوچ کا مرکز و محور قرآن مجید ہی کی آیات ہوتی ہیں۔ امیر محترم امتِ مسلمہ کے عروج و زوال کی تاریخ بیان فرما رہے تھے اور زوال کے اسباب پر غور و فکر کی دعوت دے رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہماری اس گفتگو کا مقصد کوئی مرثیہ کہنا نہیں ہے' بلکہ ان اسباب کا کھوج لگانا ہے کہ آج ہم زوال کی اس انتہا تک کیسے پہنچ گئے ہیں۔ ہمارا یہ زوال و انحطاط یکدم عمل میں نہیں آیا بلکہ یہ صدیوں پر محیط ہے۔ دورِ نبوت کے بعد خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہوئی۔ اس کے بعد کٹ کھنی ملوکیت آگئی جس کے آتے ہی اس عظیم الشان قصر کی پہلی منزل زمین بوس ہوگئی' یعنی خلیفہ کا انتخاب عام مسلمانوں میں سے ہونے کی بجائے موروثی بادشاہت کا طریقہ رواج پاگیا۔ اس منزل کے گرتے ہی زوال کا عمل شروع ہوگیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امت مسلمہ کو جبر کے گرداب میں دھکیل دیا گیا۔ غلامی خواہ اپنوں کی ہو یا غیروں کی' وہ حریتِ فکر کو کچل دیتی ہے۔ امیر تنظیم اسلامی نے اپنا تجزیہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس زوال کا سب سے بڑا سبب قرآن مجید سے کٹ جانا ہے۔ یہ کتاب کتابِ ہدایت تھی' لیکن اس سے عملی اور فکری رہنمائی کی بجائے اسے محض تلاوت اور برکت کے حصول کا ذریعہ سمجھ لیا گیا۔

آپ کی یہ تقریر ڈیڑھ گھنٹہ پر محیط تھی۔ آپ نے ہندو ذہنیت اور بھارت میں ہندو نیشنلزم کے احیاء کے اسباب پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اس کا سب سے اہم نکتہ یہ تھا کہ ہندو تہذیب کے احیاء کی دعویدار جماعت جس کے ارکان کی تعداد تقریباً ۲۵ لاکھ ہے اور جو نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے کام کر رہی ہے اس نے آج تک الیکشن میں حصہ نہیں لیا۔ چنانچہ آج وہ ایک بہت بڑے پریشر گروپ کے طور پر ابھری ہے اور آج بھارت میں اقتدار کی کنجی اس کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارے یہاں کی دینی جماعتیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کبھی بھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتیں الیکشن میں اپنا وقت' صلاحیتیں اور توانائیاں ضائع کر رہی ہیں۔ آپ نے زور دے کر فرمایا کہ اس ملک میں کرنے کا کام یہی ہے کہ اللہ کی کتاب سے اپنا تعلق مضبوط بنایا جائے۔ غلبۂ دین کے لئے اس کتاب سے وہ جذبہ پیدا ہوگا جو دورِ اول میں ہوا تھا۔ جو لوگ اپنے فرض کو پہچان لیں وہ منظم ہوں' ان کی تربیت کی جائے اور الیکشن کی سیاست سے کنارہ کش رہتے ہوئے ایک بڑا پریشر گروپ تشکیل دیا جائے۔

جمعہ کا دن رفقاء کی آمد کا دن تھا۔ پاکستان کے تمام گوشوں سے ذمہ دار حضرات کشاں کشاں چلے آرہے تھے۔ اکیڈمی کے دفتر میں استقبالیہ قائم کیا گیا تھا جہاں آنے والوں کا اندراج ہوتا تھا اور انہیں رہائش کے لئے کمرہ کا نمبر دیا جاتا تھا۔ ہفتہ ۲۶ دسمبر کا دن تو سعی مشاورت کے لئے وقف تھا۔ سال میں دوبار یا حسبِ ضرورت یہ مشاورت منعقد کی جاتی ہے۔ اس

توسیعی مشاورت میں تمام رفقاء شرکت کر سکتے ہیں۔ انہیں کھلی اجازت ہوتی ہے کہ وہ امیرِ محترم اور منتخب مجلسِ مشاورت کے ارکان کی موجودگی میں امیرِ محترم کی ذات' تنظیم کی پالیسی اور ہونے والے تمام فیصلوں پر اظہارِ خیال کر سکیں۔ امیرِ محترم اور مرکزی ٹیم کی حیثیت سامع کی ہوتی ہے اور رفقاء باری باری آکر اپنی بات کرتے ہیں۔ اس کے متعدد فائدے ہیں۔ اس سے رفقاء کے اندر کی گھٹن ختم ہوجاتی ہے' ان کے تند و تیز جملے صبرو تحمل سے سنے جاتے ہیں' تنظیم میں رفقاء کی سوچ کا رخ معلوم ہوتا ہے' ان کی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ بیعت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جو بات ایک رفیق کی نگاہ میں حق ہے وہ اسے بے دھڑک بیان کرے۔ پھر امیرِ تنظیم اسے اپنے لئے "فیڈ بیک" سمجھتے ہیں۔ تمام رفقاء کے اظہارِ خیال کے بعد امیرِ محترم ان تمام خیالات وسوالات کے جواب سے رفقاء کو مطمئن کردیتے ہیں۔

یہ روایت خود امیرِ محترم نے قائم کی ہے جو نہ کسی جمہوری جماعت میں ہے اور نہ کسی دینی جماعت میں۔ جو لوگ جمہوریت کے چمپئن بنتے ہیں ان کے یہاں اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ تقریباً چودہ افراد نے اپنی بات تفصیل سے بیان کی۔ کسی نے کہا رفقاء میں فرائض دینی کا تصور کمزور ہے' اس لئے ان میں حرکت پیدا نہیں ہوتی۔ آسان لٹریچر کا مطالبہ بھی کیا گیا جس کی کمی متعدد افراد نے محسوس کی ہے۔ کسی نے "کتاب الایمان" مرتب کرنے کا مشورہ دیا۔ کسی نے کہا کہ نظم ڈھیلا ہے' باز پرس نہیں کی جاتی۔ ندائے خلافت کی بے قاعدگی کا ذکر بھی کیا گیا۔ جماعتِ اسلامی کے سلسلے میں کئی رفقاء نے اپنے اپنے زاویۂ نظر کو پیش کیا اور اس ضمن میں مشورے دیئے۔ یہ بات بھی سامنے آئی کہ قیامِ خلافت کے بعد ہمارا کیا ڈھانچہ ہوگا' تعلیمی نظام کس طرح کا ہوگا' سیاسی اور سماجی نظام کے خدوخال کیا ہونگے' ہمیں ابھی سے اس پر کام کرنا چاہئے۔ رفقاء کے تمام نقطہ ہائے نظر پر تبصرہ کرتے ہوئے امیرِ محترم نے بعض باتوں کو درست قرار دیا اور بعض کی غلط فہمیاں واضح کیں۔ توسیعی مشاورت میں وہ رفقاء بھی شریک تھے جو تنظیم میں کسی منصب پر نہیں اور وہ رفقاء بھی تشریف لائے تھے جو بیعت کرنا چاہتے تھے۔ ان کے دلوں میں غلبۂ دین کی جدوجہد کے جذبات موجزن تھے۔ وہ بیعتِ جہاد کے لئے بے تاب تھے۔ ناظمِ حلقہ نے امیرِ محترم سے اس کے انعقاد کی اجازت لے لی تھی۔ یہ منظر دید کے قابل تھا۔ اللہ کے دین کے پروانے دورویہ قطار میں دوزانو ہو کر بیٹھ گئے۔ ایک لمبی چادر ان کے درمیان تھی جسے ہر ایک نے پکڑ رکھا تھا۔ اس کا ایک سرا امیرِ تنظیم کے ہاتھ میں تھا۔ امیرِ تنظیم بیعت کے الفاظ کہتے اور بیعت کرنے والوں کے ساتھ تمام رفقاء ان الفاظ کو دہراتے۔ اللہ کے حضور یہ عہدو پیمان ہورہا تھا کہ ہم مومن بن کر جئیں گے اور مومن بن کر مرینگے' شہادت ہماری منزل ہے اور رضائے الٰہی ہمارا نصب العین ہے۔ اس کے بعد امیرِ تنظیم نے

استقامت کے لئے دعا فرمائی۔ تو سیعی مشاورت کی یہ نشست نماز عشاء تک جاری رہی۔

جیسا کہ تحریر کیا جا چکا ہے کہ یہ تربیت گاہ تنظیم کے صرف ان رفقاء پر مشتمل تھی جو کسی نہ کسی ذمہ داری کے حامل تھے' لیکن جامع القرآن قرآن اکیڈمی کے مستقل نمازیوں کو بھی محروم نہیں رکھا گیا۔ ہر فرض نماز کے بعد جناب رحمت اللہ بٹر صاحب ایک حدیث پڑھ کر سناتے اور اس کی مختصر تشریح بھی فرماتے۔

دوسرے روز یعنی ۲۷ دسمبر بروز اتوار بعد نماز فجر جناب رحمت اللہ بٹر صاحب نے فرض اور نفل عبادات کے حوالے سے گفتگو کی۔ انہوں نے فرض' واجب' سنت مؤکدہ' سنت غیر مؤکدہ اور مستحب کی تشریح فرمائی اور بورڈ پر لکھ کر ایک چارٹ کی صورت میں اس کی وضاحت کی۔ انہوں نے کہا فرض نماز باجماعت ادا کرنا ضروری ہے۔ جنگ میں بھی حضورؐ نے باجماعت نماز ادا کی ہے۔ فرض کے علاوہ جو بھی نوافل ہیں وہ گھر میں پڑھنا افضل ہیں۔ فجر کی سنتوں کا التزام سفر میں بھی کرنا چاہئے۔ جناب بٹر صاحب نے رفقاء کے سوالات کے جواب بھی دیئے۔ اس کے بعد ناشتہ اور دیگر ضروریات کے لئے وقفہ تھا۔

۹-۳۰ بجے دوسرا اجلاس شروع ہوا۔ یہ اجلاس اس اعتبار سے بہت اہم تھا کہ اس میں تنظیم کے اندرونی نظام اور اس میں پیدا ہونے والی بعض غلط فہمیوں پر گفتگو کی گئی تھی۔ جناب سراج الحق سید صاحب نے تنظیم کے ذمہ داروں سے مل کر ایک جائزہ رپورٹ مرتب کی تھی جس پر مرکزی مجلسِ عاملہ اور مشاورت میں بھی بحث ہو چکی تھی۔ جناب سید صاحب نے اسے سائنٹیفک انداز میں ترتیب دیا تھا۔ اس مختصر روداد میں اس جائزے کی تفصیلات نہیں پیش کی جاسکتیں۔ میں اگر اسے اپنے الفاظ میں بیان کروں تو وہ یہ ہوگا کہ یہ بڑے حکیمانہ انداز پر مرتب کیا گیا تھا اور اسی ضمن میں بعد کے جو پروگرام سید صاحب نے بزنس ایڈمنسٹریشن کے حوالے سے رکھے انہوں نے تمام شکوک و شبہات کو کافور کر دیا۔

پندرہ منٹ چائے کے وقفے کے بعد مطالعۂ لٹریچر کا پروگرام تھا جس کا عنوان تھا "اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید اور اس سے انحراف کی راہیں"۔ مطالعہ لٹریچر امیرِ محترم کی موجودگی میں ہوتا۔ جناب مختار حسین فاروقی صاحب پڑھتے اور ضروری تشریح امیرِ محترم ساتھ ہی کرتے جاتے۔ اس طرح یہ پروگرام ایک بجے تک رہتا۔ ایک بجے سے نماز عصر تک طعام اور آرام کا وقفہ تھا۔

تمام رفقاء کے ۹ گروپ بنادیئے گئے تھے' ہر گروپ کا ایک لیڈر ہوتا' ہر روز اس گروپ کا دوسرا لیڈر مقرر ہوتا۔ عصر سے مغرب تک یہ گروپ مطالعہ لٹریچر پر اپنے اشکالات اور سوالات پر باہم بحث کر کے ان کو حل کرنے کی کوشش کرتے۔ جو سوال حل نہیں ہو پاتے وہ نوٹ کر لئے

جاتے۔ بعد مغرب گروپ لیڈر ان سوالات کو امیرِ محترم کے سامنے پیش کرتا۔ امیرِ محترم اس کا جواب دیتے اور تمام رفقاء اس سے مستفید ہوتے۔ یہ نشست اگر عشاء تک ختم نہ ہوپاتی تو بعد نماز عشاء بھی جاری رہتی۔ اس پروگرام کے بعد نصف گھنٹہ کا پروگرام جناب مرزا محمد ایوب بیگ صاحب کا ہوتا جو پاکستان کی سیاسی تاریخ کا جائزہ لیتے۔ اس جائزے کو آپ نے تقسیم ہند سے قبل کے حالات سے شروع کیا اور ان عوامل کا تذکرہ بھی کیا جو تقسیم ہند کے محرک تھے۔ اس جائزے میں زیادہ تر مسلم لیگ فوکس میں رہی' اس لئے کہ وہی پاکستان کی تحریک کی واحد وارث ہے۔ یہ پروگرام خاصا دلچسپ تھا اور ان پانچ دنوں میں پاکستان کے حکمرانوں اور ان کی کارگذاریوں کی ایک تصوراتی فلم ذہن سے گذر گئی۔

صبح کے پروگراموں میں عنوان بھی بدلتے رہے اور مقررین بھی۔ بقیہ چار پروگرام مستقل نوعیت کے تھے جو ان دنوں جاری رہے۔ دوسرے دن مطالعہ لٹریچر میں "پاکستان کی قومی سیاست میں مذہبی جماعتوں کا کردار" اور "پاکستان سیکولرزم اور اسلامی فنڈا منٹلزم کے فیصلہ کن دوراہے پر" زیرِ مطالعہ آئے۔ یہ جائزہ بھی خاصا دلچسپ اور معلوماتی تھا۔ جن لوگوں نے پاکستان میں آنکھ کھولی ہے ان کی مزید آنکھیں کھولنے کے لئے اس کا مطالعہ بہت ضروری تھا۔ مطالعہ کے دوران کوئی اکتاہٹ محسوس نہیں کی جاتی تھی بلکہ درمیان میں امیرِ محترم کی وضاحت مضمون میں جان ڈال دیتی' حالانکہ یہ تمام مضامین انہی کے تھے۔

تیسرے دن کا مطالعہ "فکرِ اقبال کی تعمیل کا تاریخی جائزہ" پر مشتمل تھا۔ یہ مضمون چونکہ خالص فلسفیانہ تھا' اس لئے امیرِ محترم نے اس کی خوب خوب وضاحت کی۔ اس مضمون میں برِعظیم ہندوپاک میں فکرِ اقبال کے تسلسل کی تاریخ بیان ہوئی ہے جسے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اپنایا' مطلع ہند پر وہ گھنگھور گھٹا کی طرح اٹھے' خوب گرجے' خوب برسے اور صرف دس سال کے اندر بوریا بستر سمیٹ کر خود کو قومی تحریک کے دھارے میں ڈال دیا۔ ان کے جانے کے بعد مولانا مودودی مرحوم نے یہ کہا کہ ایک شخص ہمیں جگا رہا تھا' جب ہم جاگے تو وہ سوگیا۔ مولانا مودودی مرحوم مولانا آزاد کو ان کی زندگی ہی میں مرحوم قرار دے کر اس مشن کو لے کر آگے بڑھے۔ مولانا مودودی فکرِ اقبال کے امین تھے۔ ہندوستان میں آزادی کی تحریک بلکہ تحریکیں (یعنی کانگریس اور مسلم لیگ) زور شور سے چل رہی تھیں۔ مولانا مودودی مرحوم نے اس کے علی الرغم خالص احیائی انداز پر کام شروع کیا۔ قومی تحریک پر' جس کا جھنڈا مسلم لیگ کے ہاتھ میں تھا' بھرپور تنقید کی۔ ان کی اس آواز پر کچھ لوگ جمع ہوئے اور جماعتِ اسلامی کی بنیاد ڈالی گئی' اس طرح فکرِ اقبال کا تسلسل قائم رہا۔

چوتھے دن "جماعتِ اسلامی کی تاریخ کا تیسرا اور شدید ترین بحران" کا مطالعہ کیا گیا۔ اس

کا مطالعہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ تنظیم اسلامی اس تحریک کا تسلسل ہے۔ پاکستان بننے کے بعد جماعتِ اسلامی نے اپنے ہدف کے حصول کے لئے ایک قومی سیاسی جماعت کا انداز اختیار کیا۔ یہ فیصلہ اس وقت اس لئے کیا گیا کہ ملک میں سیاسی خلاء پیدا ہو گیا تھا۔ "شارٹ کٹ" کے ذریعہ اقتدار تک پہنچ کر نفاذِ اسلام کا منصوبہ تھا جو ۴۵ سال گذرنے کے بعد بھی روبہ عمل نہ آسکا۔ آج بھی وہ اسی سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ اس پر ہم افسوس کے سوا اور کیا کرسکتے ہیں۔ رفقاءِ تنظیم اسلامی کو قریب کی اس تحریک کو خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ اس کے سفر کے تمام سنگ ہائے میل کو کھلی آنکھوں سے دیکھ لینا چاہئے' اس لئے کہ ہم بھی اسی راہ کے مسافر ہیں۔ وہ کارواں جو نام نہاد جمہوریت کی پر پیچ وادیوں میں اپنا راستہ تلاش کررہا ہے جانے کہاں جاکر رکے!

جس شخص کو کوئی کام نہ کرنا ہو وہ تو ماضی کو ایک تاریخ کی حیثیت سے دیکھے گا' لیکن جو شخص ایک تحریک کو لے کر چل رہا ہے وہ تو ماضی کی تحریکوں کا ناقدانہ جائزہ لے گا' ان کے ہر موڑ کا تجزیہ کرے گا' ان کی ناکامی کے اسباب کا سراغ لگائے گا' جو لوگ ان تحریکوں کو لے کر چل رہے تھے ان کا فکری تجزیہ بھی کرے گا۔ (یہ کام ماضی قریب میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے بھی کیا ہے' یہ ہر تحریک کی ضرورت ہے۔ مولانا مرحوم نے تجدید و احیائے دین اس لئے لکھی تھی۔) پھر جس زمانے میں وہ کام کررہا ہے اس کے دائیں بائیں جو تحریکیں چل رہی ہیں وہ ان کا بھی جائزہ لے گا۔ مولانا مودودی مرحوم کا ایک معتدبہ لٹریچر انہی تنقیدات پر مشتمل ہے۔ ہمارے لئے بھی ناگزیر ہے کہ ہم اپنے دور کی تحریکوں کا بھرپور تنقیدی جائزہ لیں۔ جس طرح یہ ضرورت پہلے تھی آج بھی ہے۔ جو لوگ اس تنقید پر اعتراض کرتے ہیں وہ لوگ مولانا مودودی مرحوم کی ان تنقیدات کو کیوں بھول جاتے ہیں؟ پھر اس میں ایک اہم بات یہ ہے کہ وہ "پیٹرن" جسے ہم درست سمجھتے ہیں' جسے بالفاظِ دیگر "اقامتِ دین کا تصور" کہتے ہیں' اس وقت اس کی ہمارے علاوہ واحد دعویدار جماعت جماعتِ اسلامی ہے۔ اس تصور سے ملک میں بیک وقت دو تحریکیں چل رہی ہیں تو لوگوں کو التباس سے بچانے کے لئے بھی ہمیں ہر قدم پر وضاحت کرنی پڑے گی۔ یہ ایسی اہم ضرورت ہے جس کا شعور تنظیم کے رفقاء کو نہ ہوگا تو وہ قدم قدم پر ڈگمگا جائینگے۔ انہیں واضح طور پر ان راستوں کے فرق کو سمجھ لینا چاہئے۔

دوسرا مستقل پروگرام جناب سراج الحق سید صاحب کا تھا جو پروجیکٹر کے ذریعہ سوال قائم کرتے' پھر سامعین سے جواب مانگتے' پھر صحیح جواب خود عنایت فرماتے۔ انہوں نے بزنس ایڈمنسٹریشن کے حوالے سے تنظیم کا جائزہ لیا۔ یہ جائزہ جیسا کہ عرض کرچکا ہوں نہایت دلچسپ اور ذہن میں اتر جانے والا تھا' بہت سے وہ مباحث جو طویل مقالوں کے بعد بھی حل نہیں

ہوسکتے تھے موصوف ایک چارٹ کے ذریعہ چٹکی بجا کر حل کر دیتے۔ جو لوگ اس دلچسپ انداز کو دیکھنا چاہیں وہ اس کی ویڈیو حاصل کر کے دیکھ سکتے ہیں۔

دوسرے روز نماز فجر کے بعد جناب ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب نے تنظیم اسلامی کے سنگ ہائے میل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب تنظیم کے اہم ساتھیوں میں سے ہیں۔ انہوں نے تنظیم کے مقاصد کو اپنے اندر خوب جذب کیا ہے۔ وہ امیرِ محترم کی ایک ایک ادا پر فدا ہونے والوں میں سے ہیں۔ انہوں نے تفصیل سے تنظیم اسلامی کے سنگ ہائے میل بیان کئے۔ اس بات کی شدید کمی محسوس ہوئی کہ ان سنگ ہائے میل کو روداد کی شکل میں جمع نہیں کیا جاسکا۔ یہ ایک بڑی کمی ہے جسے امیرِ محترم نے بھی محسوس کیا۔ چنانچہ انہوں نے جناب عبدالرزاق صاحب ناظم اعلیٰ پاکستان کو نوٹ کرایا کہ اس کمی کا ازالہ کرنا ہے۔

ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کہہ رہے تھے کہ ۲۷۔ ۲۸ مارچ ۱۹۷۵ء میں تنظیم کی تاسیس ہوئی جس میں ۱۰۳ افراد نے شرکت کی۔ اس سے قبل جولائی ۱۹۷۴ء کو ایک اکیس روزہ تربیت گاہ منعقد ہوئی تھی جس میں تنظیم کے قیام کا اعلان ہوا تھا۔ تاسیسی اجلاس کے دوسرے دن جب بیعت کا مرحلہ آیا تو ۷۵ افراد نے بیعت کی۔ یہ ایک عمومی بیعت تھی' جبکہ اصل اور حتمی فیصلہ ۱۹۷۷ء میں ہوا کہ آئندہ تنظیم کو اسی بیعت کی بنیاد پر استوار کرنا ہے۔ ۱۹۷۶ء میں پہلا سالانہ اجتماع ہوا۔

تیسرے دن بعد نماز فجر جناب عبدالرزاق صاحب ناظم اعلیٰ پاکستان کو دعوتِ دین اور اس کے طریقِ کار پر گفتگو کرنی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ انسان کی تخلیق کا مقصد امتحان ہے۔ انسان کو جو صلاحیت دی گئی ہے اسی بنا پر اس کا امتحان ہوگا۔ اللہ نے ایک مزید سلسلہ نبوت کا جاری کیا تاکہ انسان پر مزید حجت قائم ہوجائے۔ حجت کو قائم رکھنے کے لئے دو انتظامات فرمائے۔ ایک یہ کہ اللہ نے اپنی کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری خود لی' دوسرے یہ کہ اس ذمہ داری کو پوری امت پر ڈال دیا کہ یہ امت اس پیغام کو دنیا کے ہر فردِ بشر تک پہنچائے۔ جو لوگ اس کام میں لگ جائیں وہ حزب اللہ ہیں۔ یہ اس امت کے لئے بڑا اعزاز ہے اور اس کی ناقدری بدبختی کی علامت ہے۔ اگر ہم نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو توفیقِ عمل سلب ہوسکتی ہے۔ ناظم اعلیٰ فرمارہے تھے کہ ہم نے اسے شعوری طور قبول کیا ہے' پھر قدم کیوں آگے نہیں بڑھ رہے ہیں؟ جذبۂ محرکہ یہ ہونا چاہئے کہ یہ ہمارا فرض ہے' کوئی اور کرے نہ کرے ہمیں خود کرنا ہے۔ داعی کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اسے صرف اللہ کی رضا مطلوب ہو' نیت میں اخلاص ہو' اپنے عمل کا جائزہ لیتا رہے' اس کا عمل دکھاوے کے لئے ہرگز نہ ہو کہ دکھاوے کا کام شرک بن جاتا ہے۔ ایثار' قربانی اور صبر ایک داعی کی صفات ہیں۔ ہدایت تو صرف اللہ کے ہاتھ

میں ہے۔ اللہ سے تعلق قائم کرنا داعی کی اپنی ضرورت ہے۔ اللہ سے رابطہ کے لئے قیام اللیل ضروری ہے۔ اگر انسان میں جذبہ موجود ہو تو راستہ ملتا ہے۔ مساجد' کلینک' ٹرین' بس' جہاں بھی موقع ملے دعوت کا کام کریں۔ سالانہ اجتماع تک میں آپ لوگوں کو ایک چھوٹا سا ہدف دیتا ہوں کہ آپ میں سے ہر رفیق اس دوران ایک شخص کو اس دعوت سے اچھی طرح روشناس کرادے کہ وہ اچھی طرح سمجھ جائے اور آپ کا ساتھی بن جائے۔

تربیت گاہ کے چوتھے دن صبح کا موضوع خانقاہی نظامِ تزکیہ بمقابلہ انقلابی عملِ تزکیہ تھا۔ اسے جناب مختار حسین فاروقی صاحب کو بیان کرنا تھا۔ آپ گویا ہوئے کہ حضور کے دور اور خلافتِ راشدہ کے دور میں باطنی اصلاح کے ادارے الگ نہ تھے' یہ ایک وحدت تھی۔ جب ملوکیت کا دور آیا تو جہاد و قتال حکومتِ وقت کی ذمہ داری قرار پائی اور باطن کی اصلاح کے لئے تصوف کے نام سے ادارے قائم ہوگئے۔ آپ نے اقبال کے دو اشعار سے اس کی وضاحت کی

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
یہ مسلک مردانِ خود آگاہ خدا مست
وہ مذہب ملا و نباتات و جمادات

ہمارا تنزل ایک دن میں نہیں ہوا' آہستہ آہستہ ہوا ہے۔ مجاہدانہ تربیت یا انقلابی تربیت ہے کیا؟ جیسا کام ہو ویسی تربیت ہوتی ہے اور ہونی چاہئے۔ اقامتِ دین کے لئے متصوفانہ تربیت ناکافی ہے۔ ہمارے نزدیک جو مقصد پیشِ نظر ہے اس کی تربیت دوسرے انداز پر ہونی چاہئے۔ اسلامی انقلابی جماعت کے افراد کا پہلا ہدف قرآن کا پڑھنا' اسے حرزِ جان بنانا ہے' خصوصاً رات کو تہجد میں قرآن کا پڑھنا۔ دوسرا وصف قرآن مجید کے حوالے سے اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ ہے۔ جو اس مشن سے تعلق رکھتے ہیں وہ دوست ہیں' ہم مقصد ساتھی ہیں۔ باقی لوگوں سے دلی الفت نہیں ہونی چاہئے۔ تیسرا وصف اللہ کے راستے میں جہاد اور شوقِ شہادت اور چوتھا وصف لومۃ لائم سے بے نیازی ہے۔ یہ اوصاف اس وقت پیدا ہونگے جب آپ تین کام کرینگے پہلا انقلابی فکر کا استحضار' دوسرا قرآن مجید کی تلاوت اس کے معانی کو سمجھ کر اور عمل میں اسے حرزِ جان بنانا' تیسرا اس راہ میں پہنچنے والی ہر ایذا پر صبر و استقامت۔ نفسانی مرغوبات اس راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں' لہٰذا نفس کی مخالفت کا عادی بنئے --- جناب مختار حسین فاروقی صاحب کا انداز دل میں اترنے والا اور ان کی باتیں صاف اور آسانی سے سمجھ میں آنے والی تھیں۔ ان کی گفتگو فلسفیانہ انداز کی نہ تھی' بلکہ دو اور دو چار کی طرح سمجھ میں آنے والی تھی۔

اس انقلابی تربیت گاہ کے آخری دن صبح کا پروگرام جناب رحمت اللہ بٹر صاحب کے سپرد تھا۔ ان کا موضوع تھا اسلامی رسومات۔ آپ نے فرمایا کہ جو رسومات خیرالقرون میں تھیں ان کو اختیار کیا جائے اور بعد کی رسومات چھوڑ دی جائیں۔ ہر رفیق سنت کا زیادہ سے زیادہ اتباع کرے۔ پیدائش پر جو رسومات ہوتی ہیں ان میں صرف عقیقہ سنت ہے جو ساتویں دن مسنون ہے۔ یہ صدقہ بھی ہے شکرانہ بھی' مگر یہ ایسا صدقہ ہے جسے آپ خود بھی کھا سکتے ہیں اور دوستوں کو بھی کھلا سکتے ہیں۔ سالگرہ کا دوسرا نام میلاد ہے جو درست نہیں۔ نکاح کا اعلان عام کیا جائے۔ یہ بات حضورؐ نے فرمائی ہے۔ پھر دعوتِ ولیمہ سنت ہے اور اس کی تاکید بھی ہے۔ جہیز' برات' منگنی' مایوں' مہندی' لڑکی والوں کے یہاں کھانا' یہ سب چیزیں غلط ہیں۔ فوتیدگی پر نماز جنازہ' تدفین اور تین دن تک سوگ سنت ہے' جبکہ سوئم' دسواں' بیسواں' چہلم' برسی اور عرس سب بدعات ہیں۔ ایصالِ ثواب کے مروجہ طریقے بھی سنت سے ثابت نہیں' اس کا بہترین طریقہ دعا ہے۔

اس تربیت گاہ کے آخری دن کا آخری پروگرام امیرِ محترم کا خطاب تھا۔ یہ خطاب غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا جس کا احاطہ اس رپورٹ میں نہیں کیا جاسکتا۔ پھر امیر محترم کے خطاب کا منفرد انداز اور اس میں جذبات کے زیروبم کے قلم وقرطاس کہاں متحمل ہوسکتے ہیں۔ رفقاء سے میری درخواست ہے کہ اس کی ویڈیو فلم ضرور دیکھیں۔ تاہم بعض باتیں اختصار سے درج کی جارہی ہیں۔ امیرِ محترم نے فرمایا کہ سب سے پہلے ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ تربیت گاہ پروگرام کے مطابق تکمیل پذیر ہوئی۔ کسی چیز کا تکمیل پا جانا اذنِ رب کے بغیر ممکن نہیں۔ ہماری توقع سے زیادہ لوگوں نے شرکت کی۔ پھر انتظامات بہت عمدہ رہے۔ تربیت گاہ کے پروگرام کے متعلق ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ہماری یہ تربیت گاہ ایک فکری ریفریشر کورس کی نوعیت کی تھی۔ استقامتِ فکر بہت ضروری ہے' میری اصل متاع یہی ہے۔ جو شے جتنی اہم ہو اسے اسی انداز میں لینا چاہئے۔ شریعت' فلسفہ' تصوف' اور سائنس ان چاروں کو جوڑ کر قرآن کے ساتھ باندھنا' یہی وہ فکری رہنمائی ہے جو اب میرے ذمے رہے گی۔ بقیہ تحریک کا کام مرکزی ٹیم کے ذمے ہوگا۔ اس تربیت گاہ میں ہم نے اپنی تحریک کو موجودہ وقت کے فریم میں دوبارہ سمجھا ہے۔ اپنے افق ذہنی کو وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم ایک تحریک کے تسلسل میں ہیں۔ دو اعتبارات سے محنت کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ آپ اپنی تنظیم کو چلتا ہوا قافلہ بنادیں۔ دوسرے آپ نے اس تربیت گاہ سے جو کچھ سیکھا ہے اسے استعمال کریں۔ تنظیم میں آپ لوگ ذمہ داری کے منصب پر ہیں۔ آپ کو اتنی عربی تو آنی چاہئے کہ براہِ راست قرآن مجید سمجھ سکیں۔ خط وکتابت کورس سے کوئی آدمی اپنے کو مستثنیٰ نہ سمجھے۔ مطالعہ لٹریچر کا

جو نصاب یہاں پڑھا ہے رمضان المبارک سے قبل ملتزم رفقاء تک پہنچادیں۔ جو لوگ قرآن مجید کا درس دے سکتے ہیں انہیں پبلک مقامات پر درس دینے کے لئے تیار کریں۔ اب یہ بوجھ عملاً آپ لوگوں کو اٹھانا ہے۔ میری عمر سنت کے اعتبار سے پوری ہوا چاہتی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت علیؓ، شیخ احمد سرہندیؒ، شاہ ولی اللہؒ اور علامہ اقبال مرحوم سب کی عمریں رہی ہے۔ امیرِ محترم کی یہ تقریر وصیت کے انداز کی تھی۔ ہر شخص کی یہ خواہش ہونی چاہئے کہ اس کی عمر بھی سنت کے مطابق ہوجائے مگر یہ وہ سنت ہے جو اختیاری نہیں ہے، یہ تو اللہ کے حساب میں ہے کہ کون کتنی زندگی لے کر آیا ہے۔ امیرِ محترم کی تقریر کے دوران اکثر رفقاء کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور خود امیر محترم کی آنکھیں بھی جھلملا رہی تھیں۔ آخری بات آپ نے یہ فرمائی کہ ایک دوسرے سے کوئی شکایت یا شکرنجی ہوگئی ہو تو ایک دوسرے کو معاف کردیں۔ دلوں کو صاف کرکے یہاں سے جائیے۔

اس اجتماع کو ناظمِ تربیت جناب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب کنڈکٹ کرتے رہے۔ اجتماع ختم ہونے سے پہلے جناب ناظمِ اعلیٰ نے شکریہ ادا کیا، جس کے جواب میں ناظم حلقۂ سندھ و بلوچستان جناب نسیم الدین صاحب نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ اگرچہ ہم اعلیٰ معیار کی مہمانی تو نہ کرسکے البتہ اس سے بڑے اجتماع کے لئے تجربہ حاصل کیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو ۱۹۹۴ء کا سالانہ اجتماع کراچی میں منعقد کرنے کی کوشش کرینگے۔ اس اجتماع کے سلسلے میں جو کمی یا کوتاہی رہ گئی ہو اس کے لئے تمام رفقاء سے معذرت چاہتے ہیں۔

چھ دن کا یہ بھرپور اجتماع بخیر و خوبی ختم ہوا۔ اس اجتماع میں ۱۱۴ افراد شریک ہوئے۔ جناب وارث خان صاحب امیر تنظیم اسلامی پشاور جن کا گذشتہ جون میں ایکسیڈنٹ ہوا تھا جس میں دونوں رانوں کی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں اپنی اس معذوری کی حالت میں بھی شریک ہوئے۔ اسی طرح شجاع آباد سے جناب حکیم عاشق حسین صاحب تشریف لائے جو مستقل معذور ہیں۔ ان دونوں حضرات کو دیکھ کر رفقاء کے جذبے کو یقیناً مہمیز لگی ہوگی۔

لیجئے، مہمانوں کو اسٹیشن پہنچانے کے لئے بس آگئی ہے، ناظمِ حلقہ سندھ و بلوچستان ان کو الوداع کہنے کے لئے باہر موجود ہیں، مہمانوں کو گرمجوشی سے رخصت کیا جارہا ہے۔ یہ منظر بھی اپنے اندر بڑی جذباتیت رکھتا ہے۔ ایک ہفتہ سب ایک ساتھ سوتے جاگتے اور پروگرام میں شریک ہوتے رہے، اب سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر جارہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ سب خیریت سے اپنی منزل پر پہنچیں اور آخرت میں بھی اسی طرح اکٹھے ہوجائیں۔ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ

اکثر رفقاء کے ٹکٹ خیبر میل سے تھے جس کا وقت ۱۰-۳۰ بجے شب تھا۔ خیبر میل سے

جانے والے رفقاء کو رخصت کرنے کے لئے ناظم حلقہ کے ہمراہ امیرِ محترم خود بھی اسٹیشن تشریف لے گئے تھے۔

تربیت گاہ کے اختتام پر رفقاء کو ایک سوالنامہ دیا گیا کہ وہ اسے پر کریں۔ اس سوالنامہ میں پوچھا گیا تھا کہ آپ لوگوں نے یہاں کے انتظام کو کیسا پایا۔ کوئی تجویز ہو تو وہ بھی تحریر کردیں۔

اگلا دن جمعہ کا تھا۔ امیرِ محترم کو گذشتہ جمعہ کی تقریر کا باقی حصہ بیان کرنا تھا۔ آپ نے گذشتہ جمعہ کی تقریر سے اپنے مضمون کو جوڑتے ہوئے فرمایا کہ بھارت میں کٹر ہندوؤں کا غلبہ ہوگیا ہے اور وہاں کا مسلمان ہندو بنیاد پرستوں کے نرغے میں آگیا ہے۔ بابری مسجد کی تہدیم اور اس کے بعد مسلمانوں کے قتلِ عام سے صورتِ حال سنگین سے سنگین تر ہوتی جارہی ہے اور ہم ہیں کہ یہاں اپنی دنیا میں مگن ہیں' ہمارے دن رات اپنی دنیا بنانے میں صرف ہو رہے ہیں۔ وہاں کے مسلمانوں کا جذبۂ ایمان تو دیکھئے کہ وہ بابری مسجد کی جگہ پر نماز ادا کرنے کی کوشش میں اس ملبہ کے ڈھیر تک پہنچنا چاہتے تھے جسے وہاں کی حکومت نے روک دیا۔ حیف صد حیف ان مسلمان حکمرانوں پر ہے جو اس سانحہ سے لاتعلق رہے۔ وہ اگر چاہتے تو بھارت کو اتنی جرأت نہیں ہوسکتی تھی۔ پھر حد درجہ افسوس کی بات یہ ہے کہ پاکستان کے وزیرِ اعظم نواز شریف اور بنگلہ دیش کی وزیرِ اعظم خالدہ ضیاء نے بابری مسجد کے بارے میں ایک مشترکہ بیان جاری کرنے سے بھی اس لئے انکار کردیا کہ کہیں بھارت اور امریکہ ناراض نہ ہوجائے۔ بھارت کو کسی عرب ملک کا خوف نہیں۔ عرب ممالک نے تو حد ہی کردی ہے کہ جن لوگوں نے مسجد کے انہدام پر اپنے جذبات کے اظہار کے لئے مظاہرہ کیا انہیں فوراً ملک بدر کر دیا گیا ---- مسلمانوں کو سوچنا چاہئے' انہیں اپنے رب کی طرف رجوع کرنا چاہئے' توبہ کرنی چاہئے' اس کی کتاب کے ساتھ جڑنا چاہئے' پھر کہیں جا کر ہم سربلند ہونگے۔

امیر تنظیم اسلامی نے جمعہ کو بعد نمازِ عصر جناب ممنون الحسن صاحب رفیق تنظیم اسلامی کا نکاح پڑھایا۔ رات میں کچھ دانشور حضرات ملاقات کے لئے آئے جن سے آپ نے گفتگو فرمائی۔ ہفتہ کی صبح جناب صلاح الدین صاحب مدیر ہفت روزہ تکبیر کی عیادت کے لئے گئے اور مولانا محمد طاسین صاحب سے ملاقات کی۔ پھر دفتر تشریف لے آئے جہاں رفقاء اور دوسرے حضرات سے ملاقات رہی۔ شام ۳۰-۶ بجے کی فلائٹ سے آپ واپس لاہور تشریف لے گئے۔

(مرتب: نجیب صدیقی)

ہم مغرب سے مقابلہ کرتے ہیں

....اور اُن ہی کی سرزمین پر!

ہم اپنے گارمنٹس بیڈلنن اور ٹیکسٹائل کی دیگر مصنوعات مغربی ممالک' اسکینڈی نیوین ممالک' شمالی امریکہ' روس اور مشرقِ وسطیٰ کے ملکوں کو برآمد کرتے ہیں اور ہماری برآمدات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے لیکن بیرونی منڈیوں میں اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لئے ہمیں انتھک محنت کرکے اپنی فنی مہارت اور معلومات میں مستقل اضافہ کرتے رہنا پڑتا ہے۔ ایسی محنت جو ہمیں رُک کر دم نہیں لینے دیتی ایسی محنت جو ہماری کارکردگی کے معیار کو اور بلند کرتی ہے' ایسی محنت جو کوالٹی' ڈیزائن اور پابندیٔ وقت کے سلسلے میں کرم فرماؤں کے مطالبات اطمینان بخش طریقے پر پورا کرنے کا ہمیں اہل بناتی ہے۔

Made in Pakistan
Registered Trade Mark

Jawad

جہاں شرط مہارت
وہاں جیت ہماری

معیاری گارمنٹس تیار کرنے اور برآمد کرنے والے

ایسوسی ایٹڈ انڈسٹریز (گارمنٹس) پاکستان (پرائیویٹ) لمیٹڈ

IV/C/3-A ناظم آباد کراچی - 18 - پاکستان - فون 610220-616018-628209

کیبل "JAWADSONS" ٹیلیکس 24555 JAWAD PK فیکس 610522 (21-92)

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

REGD NO.L 7360
VOL.42 NO.2
FEB. 1993